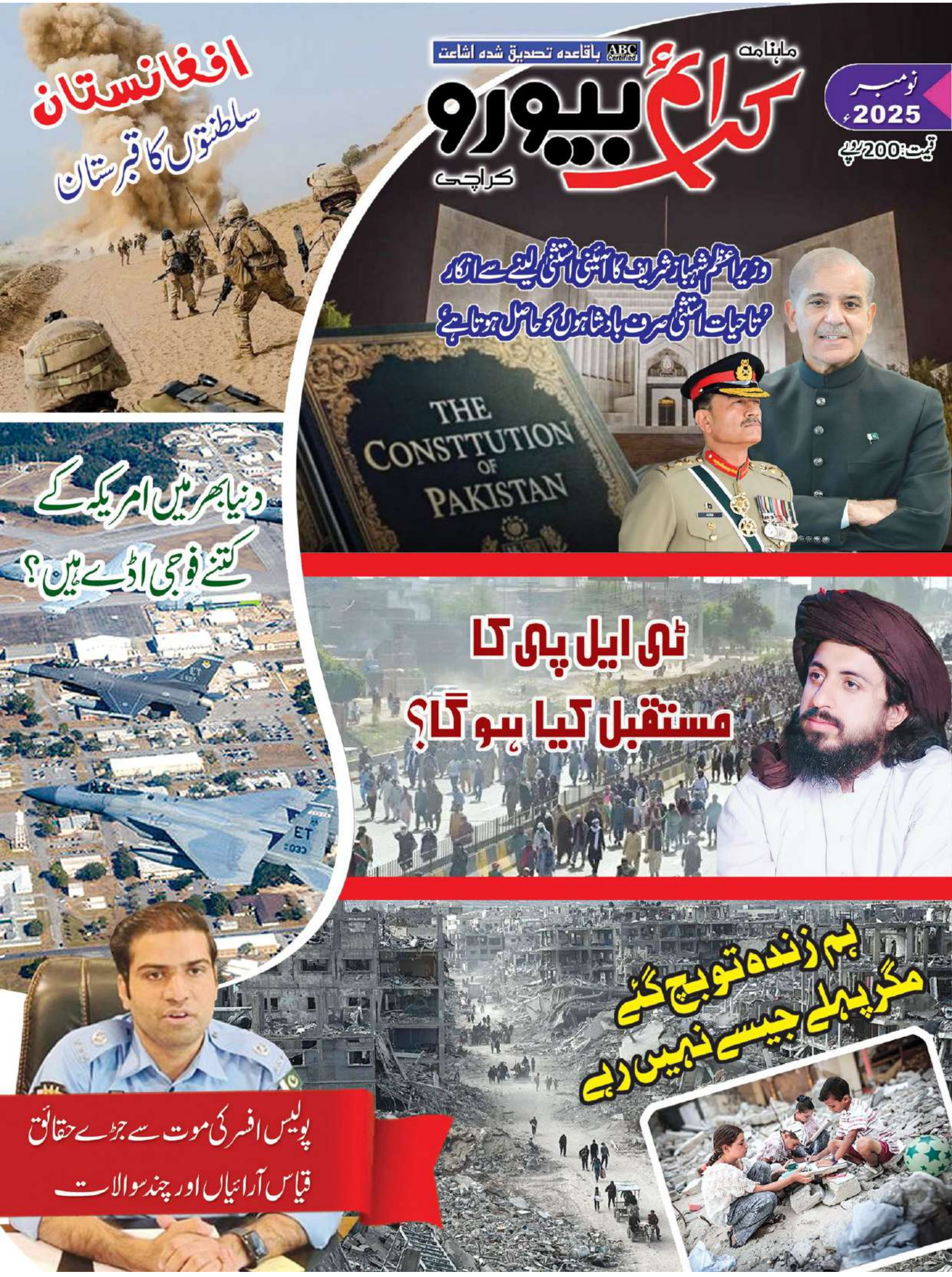
ماہنامہ
ABC Certified باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت
کرائم بیورو
کراچی
نومبر
2025ء
قیمت: 200 روپے
افغانستان
سلطنتوں کا قبرستان
وزیراعظم شہباز شریف کا آئینی استثنیٰ لینے سے انکار
تاحیات استثنیٰ صرف بادشاہوں کو حاصل ہوتا ہے
THE CONSTUTION OF PAKISTAN
دنیا بھر میں امریکہ کے
کتنے فوجی اڈے ہیں؟
ٹی ایل پی کا
مستقبل کیا ہو گا؟
ہم زندہ تو بچ گئے
مگر پہلے جیسے نہیں رہے
پولیس افسر کی موت سے جڑے حقائق
قیاس آرائیاں اور چند سوالات

CRIME STOPPERS

CRIME SCENE DO NOT CROSS

عارف عزیز

ایس ایس پی سٹی

انسپکٹر خالد رفیق

ایس ایچ او ساحل پولیس اسٹیشن

سب انسپکٹر شاہد تاج

ایس ایچ او درخشاں

انسپکٹر غلام نبی آفریدی

ایس ایچ او ڈیفنس

ماہنامہ
کرائم بیورو
کراچی
ABC Certified باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت
جلد نمبر 05 | نومبر 2025ء | شمارہ نمبر 12
قیمت: 200 روپے

فرمان مصطفیٰ ﷺ

تم اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں دعا کیا کرو کہ تم قبولیت کا یقین رکھا کرو اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غفلت سے بھرے دل سے دعا قبول نہیں کرتا۔
(ترمذی)

فرمان الٰہی

جب کوئی ٹوٹ کر تڑپ کے مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہوں۔
(سورۃ النمل 62)

فہرست

وزیراعظم شہباز شریف کا آئینی استثنیٰ لینے سے انکار	5-6
پولیس افسر کی موت سے جڑے حقائق۔ قیاس آرائیاں اور چند سوالات	7-8
تحریک لبیک کا عروج، مرید کے آپریشن اور حکومتی کریک ڈاؤن:	9-11
عاصم رحمانی چلا گیا...... صحافتی ضمیر کی تدفین!!	12
غزہ... ہم زندہ تو بچ گئے، مگر پہلے جیسے نہیں رہے	13
'گریٹر بنگلہ دیش' کے مبینہ نقشے پر وضاحت:	14
افغانستان۔ سلطنتوں کا قبرستان۔ حقیقت یا فسانہ؟	15
آغا سراج درانی بھی داغ مفارقت دے گئے	16-17
برنس روڈ مافیا کے قبضے میں آ گیا	18
دنیا بھر میں امریکہ کے کتنے فوجی اڈے ہیں؟	19-20
مختلف ممالک اپنے ذخائر میں ہزاروں ٹن سونا کیوں رکھتے ہیں	21-22
جودھ پور۔ وہ ہندو اکثریتی ریاست جو پاکستان کا حصہ بنتے بنتے رہ گئی	23-24
فلک شبیر کی 'پاکستان آئیڈل' کو اپنے گانے استعمال کرنے کی اجازت	25
ٹیکنالوجی کے اعتبار سے دنیا کے پانچ سب سے جدید شہر	26-27
بابر اعظم کیا دوبارہ 'ڈرائنگ بورڈ' پر جائیں گے؟	28
جب کوئٹہ میں رنگ برنگے بادلوں کے سبب 'میزائل تجربے' کی افواہیں پھیلیں	29
پٹنی اسپتال کا فری میڈیکل کیمپ: عوام کو معیاری علاج کی سہولت فراہم	30

پبلشر فضیل امر نے خرم پرنٹنگ پریس پاکستان چوک سے چھپوا کر آفس نمبر 1، پاکستان ہاؤسنگ اتھارٹی قائد آباد ملیر سے شائع کیا
crimebeauru@gmail.com

چیف ایڈیٹر: شیخ حسین امر
ایڈیٹر: عرفان ساگر
ڈپٹی ایڈیٹر: مارشا امر
منیجنگ ایڈیٹر: معظمہ جٹ
ایڈیٹر انوسٹی گیشن: شکیل ناچ
مجلس ادارت:
نیاز کھوکھر، راؤ جمیل، آغا خالد، ضیاء الرحمٰن، ڈاکٹر جعفر عباس، سمیر قریشی، ملیحہ عمران (انگلینڈ)، غازی صلاح الدین، فاروق مرزا (امریکہ)، عبدالوحید جیلانی، افضل سندھو، کامران خان، اسد اللہ خان، طارق پٹھان
انچارج انوسٹی گیشن ٹیم: زاہد شاہ
چیف رپورٹر: انور سلطان (0300 2056305)
کرائم رپورٹر:
عمیر خان، نعمان صافی، عبداللہ گدی، سہیل آرائیں، زید میمن
راؤ عدنان، سلطان چاکی سومرو احسن کندی (فیصل آباد)
چیف فوٹو گرافر: عبدالستار قریشی
بیورو چیف:
نوید میو (اسلام آباد) راحیل شہزاد (شہید بینظیر آباد) روشن علی کھٹیان (میرپورخاص)
سعدیہ حق (لاہور) چوہدری مستقیم (چنیوٹ) عبدالغفور سروہی (حیدرآباد)
ڈسٹرکٹ رپورٹرز:
ابرار احمد (سوات) مراد عباسی (پنو عاقل)
شہمیر قریشی (ٹھٹھہ) ساجد علی شاہ (چنیوٹ)
انچارج سندھ ڈیسک: سید انعام شاہ
قانونی مشیران:
امجد حسین قریشی ایڈووکیٹ
امان اللہ یوسفزئی ایڈووکیٹ، نظر اقبال (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

آج کے جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس سوشل میڈیا کے دور میں ہم تحقیقاتی صحافت کو زندہ رکھنے کا عزم لئے ایک ماہنامہ میگزین کا اجراء کر چکے ہیں جس میں سینئر اور تحقیقی صحافیوں پر مشتمل تجربہ کار ٹیم کی مجلس ادارت ہے۔ میگزین کا فوکس کرائم کے شعبے سے جڑے تحقیقاتی مضامین سے ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ میگزین کا ہر شمارہ ہر مہینے کی ایک دستاویز کی حیثیت کا حامل ہو۔

کراچی، اسلام آباد، لاہور، حیدرآباد، فیصل آباد، سکھر، پشاور، کوئٹہ سمیت تمام چھوٹے بڑے شہروں سے بیورو چیفس اور ضلعی نمائندگان کے تحقیقاتی مضامین اور رپورٹس آپ کو نہ صرف چونکائیں گی بلکہ ارباب اختیار کو ایکشن میں آنے پر مجبور بھی کریں گی۔

ہماری ٹیم میں شامل ہونے اور میگزین کا حصہ بننے کیلئے رابطہ کریں

واٹس ایپ نمبر: 0300 2056305

وزیراعظم شہباز شریف کا آئینی استثنیٰ لینے سے انکار

’تاحیات استثنیٰ صرف بادشاہوں کو حاصل ہوتا ہے‘

پاکستان میں اتوار کو سینیٹ اور قومی اسمبلی کی پارلیمانی کمیٹی برائے قانون وانصاف کے مشترکہ اجلاس میں 27ویں آئینی ترمیم کے مسودے پرمشاورت ہوئی مگر اس دوران آئینی استثنیٰ کا معاملہ مقامی ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا پر توجہ حاصل کرتا رہا۔

وزیراعظم شہباز شریف کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی جماعت کو 27ویں آئینی ترمیم کے مسودے میں وزیراعظم کو دی جانے والی استثنیٰ کی تجویز واپس لینے کی ہدایت دی ہے۔

ایکس پر ایک پیغام میں ان کا کہنا ہے کہ ’چند سینیٹرز نے وزیراعظم کے استثنیٰ کے حوالے سے ترمیمی شق سینیٹ میں پیش کی جو کابینہ سے منظور شدہ مسودے میں شامل نہیں تھی۔ معزز سینیٹرز کے خلوص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، میں نے انھیں یہ ترمیم فی الفور واپس لینے کی ہدایت کی ہے۔‘

27ویں آئینی ترمیم کے مسودے میں مسلح افواج سے متعلق آرٹیکل 243 میں بھی تبدیلی کی تجویز کی گئی ہے۔

اس میں کہا گیا ہے کہ فیلڈ مارشل، مارشل آف دی ایئر فورس اور ایڈمرل فلیٹ کو آرٹیکل 248 میں صدر کی طرح استثنیٰ حاصل ہوگی۔

کس کس کو آئینی استثنیٰ دینے کی تجویز تھی؟

اگرچہ آئینی ترمیم کے مسودے میں درج کئی تجاویز زیرِ بحث ہیں مگر تاحال اس کی منظوری نہیں دی گئی ہے۔ مقامی ذرائع ابلاغ کی خبروں کے مطابق اس مسودے میں ایک موقع پر صدر اور وزیراعظم کے لیے تاحیات استثنیٰ کی تجویز دی گئی تھی۔ تاہم ان خبروں کی تصدیق نہیں ہوسکی اور نہ ہی کمیٹی کی طرف سے کوئی منظوری سامنے آئی ہے۔

قومی اسمبلی سیکریٹریٹ سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ کمیٹی میں جب صدر اور وزیراعظم کو استثنیٰ دینے کی بات ہوئی تو چیئرمین سینیٹ اور سپیکر قومی اسمبلی کے لیے بھی استثنیٰ کی تجویز سامنے آئی تھی۔

اس بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ سپیکر قومی اسمبلی سردار ایاز صادق نے آرٹیکل 248 کے تحت استثنیٰ لینے سے یکسر انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ’میں عوام کا منتخب کردہ نمائندہ پہلے ہوں۔ عہدے دار بعد میں ہوں۔ کوئی استثنیٰ نہیں چاہیے۔‘

’مجھے نہ تو بطور سپیکر استثنیٰ چاہیے نہ ہی بعد میں کسی صورت استثنیٰ لوں گا۔‘

فیلڈ مارشل کو استثنیٰ دینے کی ضرورت کیوں پڑی، اس بارے میں جیو نیوز سے گفتگو کرتے ہوئے وزیر مملکت برائے قانون بیرسٹر عقیل ملک نے کہا تھا کہ ’قومیں اپنے قومی ہیروز کو سیلیبریٹ کرتی ہیں تو ہمیں کیوں نہیں کرنا چاہیے؟ چاہے ان کی استثنیٰ ہو، ان کی مراعات ہوں یا رینک اور ٹائٹل ہوں۔ ان سب کو تسلیم کرنا چاہیے۔‘

شو ’نیا پاکستان‘ کے دوران پیپلز پارٹی کے سیکریٹری اطلاعات ندیم افضل چن سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا صدر اور وزیراعظم کو تاحیات استثنیٰ دینے کی تجویز ہے؟

اس پر انھوں نے کہا تھا کہ ’ساری سروسز کا سربراہ تو صدر ہی ہوتا ہے۔ اگر ماتحت کو استثنیٰ دے رہے ہیں تو سربراہ کو کیوں نہیں دیں گے؟‘

انھوں نے طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ ’ویسے سیاسی لوگوں کو استثنیٰ کم ہی ملتا ہے۔‘

جبکہ بیرسٹر عقیل کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ معاملہ کمیٹی کے سامنے ہے اور اسے منظور نہیں کیا گیا لہذا وہ اس پر تبصرہ نہیں کریں گے۔

آئینی استثنیٰ کے معاملے پر سوشل میڈیا پر بھی ان پر تبصروں کا سلسلہ جاری ہے۔

جیسے صحافی عمر چیمہ نے ایکس پر لکھا کہ آسان لفظوں میں استثنیٰ سے مراد ہے کہ کسی شخص کو چھوا نہیں جا سکتا۔ ’ہمارے ہاں ہمیشہ سے ایسے لوگ رہے ہیں لیکن اب ہم آئین میں یہ اصول لکھ کر اس کا باقاعدہ اعلان کر رہے ہیں۔‘

صحافی عامر ضیا نے تبصرہ کیا کہ ’صدر پاکستان یا کسی بھی حکومتی اہلکار کے لیے تاحیات استثنیٰ پاکستان کے نظام پر سوالیہ نشان ہے۔ ایماندار اور آئین وقانون پر عمل کرنے والی قیادت کبھی احتسابی عمل سے خوفزدہ نہیں ہوتی۔ جمہوریت اور احتساب کا عمل لازم و ملزوم ہیں۔‘

امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر حسین حقانی نے لکھا کہ ’دلچسپ بات یہ ہے کہ رُوس کے سوا دنیا کی کسی ری پبلک کے آئین میں صدر یا کسی اور کو زندگی بھر کے لیے استثنیٰ حاصل نہیں ہے۔ مواخذہ البتہ بیشتر دساتیر میں موجود ہے۔ مقدمات اور عدالتوں سے زندگی بھر کا استثنیٰ صرف بادشاہتوں میں بادشاہوں کو حاصل ہوتا ہے۔‘

کی مدت کے دوران صدر اور گورنر کو گرفتار کرنے یا قید کرنے کی سزا نہیں دے سکتی۔

پاکستان میں آئینی اور پارلیمانی اُمور کے ماہر اور پلڈاٹ کے سربراہ احمد بلال محبوب نے اس حوالے سے بی بی سی کے نامہ نگار عمیر سلیمی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ استثنیٰ کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص پر کوئی فوجداری

ہو جائیں اور پھر ان کے خلاف کوئی فوجداری مقدمہ بنتا ہے تو کیسے انھیں استثنیٰ دیا جاسکتا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔‘

احمد بلال محبوب کہتے ہیں کہ پاکستان میں صدور کو صرف عہدۂ صدارت کے دوران استثنیٰ حاصل رہا ہے۔

مئی 2024 کے دوران اسلام آباد کی احتساب عدالت نے ٹھٹھہ واٹر

انھوں نے یہ طنز بھی کیا کہ وزیر اعظم شہباز شریف کی طرح ’دوسرے بھی اپنے اپنے عہدوں کے لیے تاحیات استثنیٰ لینے سے انکار کر دیں تو کتنا اچھا ہو۔

استثنیٰ کیا ہے اور پاکستان میں کس کو حاصل ہے؟

پاکستان کے آئین کا آرٹیکل 248 صدر کو اپنے عہدے کی مدت کے دوران کسی بھی فوجداری کارروائی سے استثنیٰ دیتا ہے۔

اس میں درج ہے کہ کسی بھی عدالت میں صدر اور گورنر کے خلاف ان کے عہدے کی مدت کے دوران کسی بھی قسم کی کوئی فوجداری کارروائی نہ شروع ہو سکتی ہے اور نہ ہی جاری رہ سکتی ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی عدالت عہدے

مقدمہ نہیں چل سکے گا۔

بی بی سی سے بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اب تک یہ معاملہ عہدے کی مدت تک محدود رہا ہے۔ ’پاکستان کے آئین میں صدر کو استثنیٰ حاصل ہے، یعنی جب تک وہ صدر ہیں تب تک ان پر فوجداری مقدمات نہیں چل سکتے۔ وہ گرفتار بھی نہیں ہو سکتے۔‘

مگر وہ کہتے ہیں کہ اب تاحیات استثنیٰ سے متعلق قیاس آرائیاں سننے میں آئی ہیں جو کہ ’کسی بھی مہذب ملک میں قابل قبول نہیں ہونی چاہییں۔‘ ’جب تک مدت ہے تب تک بات سمجھ آتی ہے، لیکن جب وہ ریٹائر

سپلائی اور پارک لین کیسز میں صدر زرداری کو استثنیٰ دیا تھا۔ اس سے قبل جون 2012 میں سپریم کورٹ نے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کو نااہل قرار دیا تھا۔ اس وقت کے صدر آصف علی زرداری کے خلاف مقدمات کھولنے کے لیے سوئس حکام کو خط لکھنے کے معاملے پر کشیدگی پیدا ہوئی تھی۔ اس کیس میں گیلانی کا موقف رہا تھا کہ صدر کو آئینی استثنیٰ حاصل ہے۔

بی بی سی کے عمیر سلیمی سے بات کرتے ہوئے سینیٹر کامران مرتضیٰ کا کہنا تھا کہ استثنیٰ لینا کمزوری کی نشانی ہے۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ’آپ کو کس چیز کے لیے استثنیٰ چاہیے؟ کیا آپ کو کوئی احساسِ جرم ہے؟‘

وہ کہتے ہیں کہ صدارتی استثنیٰ کی وجہ یہ ہے کہ ایک صدر کو کورٹ کچہری طلب کرنا مناسب نہیں ہے۔

’نہیں پتا تھا کہ تین دن بعد عدیل اکبر کے جنازے کو کندھا دینا پڑے گا‘

پولیس افسر کی موت سے جڑے حقائق

قیاس آرائیاں اور چند سوالات

’آپریٹر سرینا کے پاس ایس پی آئی نائن نے ہم سے رائفل لی ہے اور اپنے آپ کو فائر مارا ہے۔ ابھی ہم اُن کو پولی کلینک ہسپتال منتقل کر رہے ہیں۔ اوور۔‘

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں کرائم سے متعلق رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کے واٹس ایپ گروپس میں یہ وائس نوٹ جمعرات کی شام لگ بھگ پانچ بجے پوسٹ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے سوشل میڈیا پر وائرل ہو گیا۔

بی بی سی کو اسلام آباد پولیس نے اس وائس نوٹ کے مصدقہ ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ وائرلیس کال اسلام آباد پولیس کے ایس پی عدیل اکبر کے سرکاری محافظ (گن مین) کی جانب سے کنٹرول روم کو کی گئی تھی۔

یہ وائس نوٹ اُس واقعے کی ابتدائی مگر غیرمصدقہ تفصیل فراہم کرتا ہے جو گذشتہ 24 گھنٹوں سے پاکستان کے روایتی اور سوشل میڈیا پر خبروں میں ہے۔ یاد رہے کہ تاحال اسلام آباد پولیس نے سرکاری سطح پر اس بات کی تصدیق نہیں کی ہے کہ آیا عدیل اکبر نے خود کو گولی ماری، جیسا کہ وائرلیس کال میں دعویٰ کیا گیا ہے، یا نہیں۔

آئی جی اسلام آباد سید علی ناصر رضوی کے مطابق ایس پی عدیل اکبر کو گولی لگنے کا واقعہ جمعرات کی شام لگ بھگ چار بج کر 26 منٹ پر اُس وقت پیش آیا جب وہ شاہراہ دستور پر سفر کرتے ہوئے اپنے آفس کی طرف جا رہے تھے، اور اسی سڑک پر راستے میں ایک پُل کے قریب انھیں گاڑی کے اندر فائر لگا۔

آئی جی اسلام آباد کے مطابق ’اس واقعے سے متعلق اسلام آباد کے تینوں ڈی آئی جیز کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو 48 گھنٹوں میں اس واقعہ سے متعلق اپنی رپورٹ وزارت داخلہ کو پیش کرے گی۔‘ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس ضمن میں مزید کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

سرکاری سطح پر موت کی وجوہات کے بارے میں تاحال کچھ نہیں بتایا گیا۔ اسلام آباد پولیس کا کہنا ہے کہ ڈی آئی جیز پر مبنی تین رکنی ٹیم نے اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا ہے اور ایس پی عدیل اکبر کے گن مین اور ڈرائیور کے بیانات قلمبند کر لیے گئے ہیں۔

دوسری جانب پاکستان انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (پمز) میں ان کا پوسٹ مارٹم ہوا جس کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق انھیں ایک گولی سر کے سامنے لگی اور عقب سے نکل گئی۔ اس ابتدائی میڈیکل رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گولی کی وجہ سے عدیل اکبر کا دماغ شدید متاثر ہوا اور اُن کی موت بھی دماغ متاثر ہونے کی وجہ سے ہوئی۔

حکام کے مطابق عدیل اکبر کی باڈی سے دیگر نمونے بھی حاصل کیے گئے ہیں جن کو فرانزک لیب لاہور بھجوا دیا گیا ہے۔

آئی جی اسلام آباد علی ناصر رضوی نے جمعرات کی رات میڈیا کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ کہا جا رہا ہے کہ یہ واقعہ پیش آنے سے قبل عدیل کی کسی افسر سے بات ہوئی تھی۔

’جس افسر سے متعلق بات ہو رہی ہے کہ ایس پی عدیل کو فائر لگنے سے قبل ان سے بات ہوئی تھی تو ان سے بھی ہماری بات ہوئی ہے، کیا اس موبائل کال کے نتیجے میں کچھ ایسی چیز ٹریگر ہوئی، اس ضمن میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا فی الحال قبل از وقت ہوگا۔ ہم ہر پہلو سے اس معاملے کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ گاڑی کے اندر پیش آیا ہے، ہم نے سیف سٹی کیمروں کی ویڈیو فوٹیج لی ہے، اور اس فوٹیج سے بھی یہی پتہ چلا کہ باہر سے کچھ نہیں ہوا، یہ گاڑی کے اندر کا واقعہ ہے۔‘

عدیل اکبر کون تھے؟

پولیس کے 46ویں کامن سے تعلق رکھنے والے گریڈ 17 کے افسر عدیل اکبر اسلام آباد پوسٹنگ سے قبل بلوچستان میں تعینات تھے۔ آئی جی اسلام آباد علی ناصر رضوی کے مطابق وہ لگ بھگ ڈیڑھ ماہ پہلے بلوچستان سے ٹرانسفر کر کے اسلام آباد لائے گئے تھے اور انڈسٹریل ایریا میں بطور ایس پی اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

عدیل اکبر پنجاب کے وسطی علاقے مرید کے رہائشی اور شادی شدہ تھے۔

فیڈرل انویسٹیگیشن ایجنسی (ایف آئی اے) میں تعینات ایس پی حسن جہانگیر وٹو نے بی بی سی اُردو کو بتایا کہ عدیل اکبر 43ویں کامن میں اُن کے بیچ میٹ تھے۔

حسن جہانگیر وٹو کے مطابق سی ایس ایس کلیئر کرنے کے بعد پہلے انھیں آفس مینجمنٹ گروپ ملا تھا مگر اپنے نتائج اور گروپ کو بہتر کرنے کی غرض سے انھوں نے سنہ 2018 میں دوبارہ سی ایس ایس کے امتحان میں شمولیت اختیار کی جس کے بعد وہ پولیس سروس گروپ میں ٹاپ میں آئے۔

حسن جہانگیر نے بتایا کہ مارچ 2018 میں عدیل کی ابتدائی پوسٹنگ بلوچستان میں بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ہوئی اور انھوں نے اپنی مختصر سروس کا زیادہ تر وقت بلوچستان میں ہی گزارا اور حال ہی میں وہ ٹرانسفر ہو کر اسلام آباد آئے تھے۔

حسن جہانگیر وٹو کا کہنا تھا کہ سی ایس ایس کلیئر کرنے کے بعد ہونے والی ابتدائی چھ ماہ کی ٹریننگ میں بھی عدیل ان کے ہمراہ تھے اور اس دوران انھوں نے انھیں بڑا ہنس مکھ پایا۔ حسن جہانگیر کے مطابق ان کی عدیل اکبر سے آخری ملاقات دو دن پہلے ہوئی تھی جس میں تین، چار گھنٹے تک گپ شپ اور ہنسی مذاق ہوتا رہا۔

انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ تین ہی روز بعد عدیل اکبر کے جنازے کو کندھا دینا پڑے گا۔ حسن جہانگیر کا کہنا تھا کہ عدیل اکبر ایک ہنس مکھ انسان تھے جنھوں نے کبھی اپنے آپ کو درپیش مسائل کا ان کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔

ڈی ایس پی انڈسٹریل ایریا سرفراز بٹ نے بی بی سی بتایا کہ عدیل اکبر گذشتہ دنوں میڈیکل ریسٹ پر تھے کیونکہ انھیں ڈینگی ہوا تھا۔

انھوں نے کہا کہ انڈسٹریل ایریا سرکل میں جتنے بھی زیر التوا مقدمات

ہیں، اُن میں ہونے والی پیش رفت کے بارے میں وہ تفتیشی افسران سے روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ لیتے تھے۔

انھوں نے کہا کہ وہ اپنے آفس میں رات گئے تک کام کرتے تھے اور کام کے دوران انھوں نے کبھی بھی اُن کے چہرے پر تھکاوٹ کے اثار نہیں دیکھے اور نہ ہی انھوں نے کبھی بیزاری کا اظہار کیا تھا۔

’ڈاکٹر، صحافی سب ہی ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کر رہے ہیں‘

میڈیا پر جیسے ہی پولیس افسر عدیل اکبر کی گولی لگنے سے ہلاکت کی خبر کی تصدیق ہوئی، اُسی کے ساتھ قیاس آرائیوں کے ایک نا ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ہوا۔ گذشتہ 24 گھنٹے سے عدیل اکبر کی موت کی متعدد وجوہات غیر مصدقہ انداز میں شیئر کی جا رہی ہیں اور اس میں اُن کی ذاتی

زندگی تو کبھی پروفیشنل لائف اور کبھی ان کی صحت کو درپیش مسائل سے متعلق دعوے کیے جا رہے ہیں۔

عدیل اکبر کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس پر موجود مواد کو بڑے پیمانے پر شیئر کرتے ہوئے قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں اور ان پوسٹس کے تناظر میں اندازے لگائے جا رہے ہیں کہ موت کی ممکنہ وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

قیاس آرائیوں پر مبنی اس بحث کو ایک نئی جہت سوشل میڈیا پر پوسٹ کردہ اُس تحریر نے فراہم کی جس میں ایک سرکاری ڈاکٹر کی جانب سے دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ عدیل اکبر کے معالج ہیں اور اس فیس بک پوسٹ میں انھوں نے عدیل اکبر کو لاحق صحت کے مسائل سے متعلق بتایا مگر بعد ازاں انھوں نے یہ پوسٹ ڈیلیٹ کر دی۔

سوشل میڈیا پر آئے غیر مصدقہ خبروں کے اس طوفان پر بہت سے سوشل میڈیا صارفین نہ صرف تنقید کر رہے ہیں بلکہ اس بحث کے پولیس افسر کے اہلخانہ پر ممکنہ اثرات پر بھی بات کر رہے ہیں۔

وفاقی وزیر مملکت برائے داخلہ طلال چوہدری نے اسی نوعیت کی خبروں پر تنقید کرتے ہوئے جمعرات کی شام پمز ہسپتال کے باہر میڈیا کے نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ ’ہمیں اس حوالے سے بات کرتے ہوئے اس چیز کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ یہ باتیں اُن کے اہلخانہ کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنیں۔ اس معاملے میں اندازہ لگانا بہتر نہیں ہے اور اس سے گریز کرنا چاہیے۔‘

بی بی سی سے بات کرتے ہوئے صحافی اور تجزیہ نگار طلعت حسین نے کہا کہ ’اس موت کے بعد سوشل میڈیا پر پیدا ہونے والے طوفانِ بدتمیزی کے اثرات تو ظاہر ہے منفی ہیں، لیکن جب بظاہر مستند صحافی کسی کی ذاتی زندگی کو اپنی شہرت کے لیے استعمال کریں تو یہ افسوسناک کام ہے۔‘

انھوں نے کہا کہ ’اس میں بہت افواہ سازی کا عنصر بھی ہے۔ تحقیقات کے بغیر خوامخواہ بتا دیا کہ اس کی کس افسر سے بات ہوئی ہے اور یہی موت کی وجہ ہے۔ اب کون جانے کہ بات ہوئی ہے یا نہیں ہوئی، یا وہ ذہنی دباؤ کا شکار تھے۔‘

طلعت حسین کا مزید کہنا ہے کہ ’پھر جو پروفیشنل ہیں انھوں نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔ جو ڈاکٹر صاحب ہیں انھوں نے بھی پوسٹ کیا کہ وہ میرے پاس آئے تھے۔ حالانکہ ایک مریض اور معالج کے درمیان رازداری کا ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کے تحت آپ ان چیزوں کو زیرِ بحث نہیں لا سکتے۔‘

’ڈاکٹر نے بھی اپنے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کی، صحافیوں نے بھی اپنے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کی۔ ان کے دوستوں نے بھی ان کے پرانے ٹوئٹس کو لے کر تجزیے کرنا شروع کر دیے۔ ہر کسی نے بدقسمتی سے اس افسر کی ذاتی زندگی کو اور ان کے پروفیشنل اور ذاتی معاملات کو زیرِ بحث لا کر خبر بنائی ہے کہ ہمیں پتا ہے کہ اُن کے ساتھ کیا ہوا ہے۔‘

انھوں نے کہا کہ اس پس منظر میں ’خاندان کی تکلیف کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن اس تمام معاملے میں مجھے تمام پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزیاں نظر آئیں۔‘

ماہر نفسیات نوشین کاظمی نے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان اعتماد ہی سب سے پہلی اور بنیادی چیز ہے۔ ’اگر اعتماد ہوتا ہے، تب ہی مریض آپ سے بات کرتا ہے اور اسی اعتماد کے سبب ہی مریض اپنے معالج کی بات مانتا ہے۔‘

انھوں نے کہا کہ اگر کوئی ڈاکٹر کسی بھی وجہ سے اس رازداری کی شرط کو توڑتا ہے تو شاید وہ غلط پروفیشن میں ہے۔

انھوں نے کہا سوشل میڈیا پر تو اپنے کسی مریض کی ذہنی صحت کو ڈسکس کرنا تو اور بات ہے، مگر طب کے شعبے میں بھی اگر کسی مریض کو بطور کیس سٹڈی ڈسکس کرنا مقصود ہو تو شناخت چھپائی جاتی ہے۔ ’میڈیکل پریکٹس میں یہ اخلاقیات کا حصہ ہے کہ مریض کی بات اور کسی سے نہ کی جائے کجا سوشل میڈیا پر تفصیلات فراہم کی جائیں۔‘

تحریک لبیک کا عروج، مرید کے آپریشن اور حکومتی کریک ڈاؤن:

ٹی ایل پی کا مستقبل کیا ہو گا؟

رواں ماہ پاکستان کی مذہبی و سیاسی جماعت تحریک لبیک پاکستان (ٹی ایل پی) ایک بار پھر سڑکوں پر نظر آئی۔ ٹی ایل پی نے غزہ امن معاہدہ طے پا جانے کے بعد اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے کے سامنے احتجاج کرنے کے لیے لاہور سے اسلام آباد کی جانب غزہ مارچ کا آغاز کیا تھا۔

لاہور میں پرتشدد جھڑپوں کے بعد مرید کے کے مقام پر پولیس اور مظاہرین کے مابین دوبارہ شدید جھڑپیں ہوئیں جس کے نتیجے میں ہلاکتیں بھی ہوئیں۔

مرید کے واقعے کے بعد ٹی ایل پی کی قیادت اور کارکنان کے خلاف بڑے پیمانے پر کریک ڈاؤن کا آغاز کیا گیا اور پنجاب حکومت نے ٹی ایل پی کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

جمعرات کے روز پاکستان کی وفاقی کابینہ نے تحریک لبیک پاکستان کو انسداد دہشتگردی ایکٹ کے تحت کالعدم جماعت قرار دینے کی منظوری دے دی۔

لیکن یہ پہلا موقع نہیں کہ تحریکِ لبیک پاکستان کو پابندی کا سامنا ہے۔ سنہ 2021 میں سابق وزیر اعظم عمران خان کی حکومت نے اس جماعت کو کالعدم قرار دیتے ہوئے پابندی عائد کی تھی تاہم صرف سات ماہ کے عرصے کے بعد ٹی ایل پی کے احتجاج کے نتیجے میں اس وقت کی حکومت نے ایک معاہدے کے تحت یہ پابندی ہٹا دی تھی۔

یہ جماعت پرتشدد مظاہروں کے بعد حکومت سمیت اسٹیبلشمنٹ سے بھی معاہدے کرنے اور اپنے اوپر عائد ہونے والی ماضی کی پابندی کو ہٹوانے کرنے میں کامیاب رہی، اور ہر بار ریاست کو ہی پیچھے ہٹنا پڑا۔

اپنی مختصر سیاسی اور احتجاجی تاریخ کے دوران مختلف مطالبات منوانے کے لیے تحریک لبیک سات مرتبہ اسی نوعیت کے احتجاج منظم کر چکی ہے۔

ہر مرتبہ ان احتجاجوں نے پُرتشدد شکل اختیار کی اور ان کا اختتام ہر بار حکومتِ وقت سے کسی نہ کسی معاہدے پر ہوا۔ یہی نہیں، تحریک لبیک پر احمدی برادری سمیت مختلف اقلیتوں کے خلاف اقدامات کی وجہ سے مختلف مقدمات اور الزامات کا بھی سامنا رہا ہے۔

دوسری جانب تحریک لبیک کو مختلف اوقات میں دیگر مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی حمایت بھی حاصل رہی۔ چند حلقے ٹی ایل پی کے عروج میں اسٹیبلشمنٹ کے کردار کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔

اس تناظر میں بی بی سی نے اس تحریر میں یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ٹی ایل پی کیسے بنی اور یہاں تک کیسے پہنچی؟ کیا پاکستانی ریاست نے ٹی ایل پی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور کیا ایسا ممکن بھی ہو پائے گا؟

تحریک لبیک پاکستان کی بنیاد جماعت کے موجودہ سربراہ کے والد خادم حسین رضوی نے رکھی تھی۔

آگے چل کر ٹی ایل پی کے قیام کے پیچھے بڑی وجہ جنوری 2011 میں پیش آنے والا ایک واقعہ بنا۔ اس روز پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے اس وقت کے گورنر سلمان تاثیر کو ان ہی گارڈ نے اسلام آباد میں گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔

ممتاز قادری کے اعتراف کے بعد انھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی اور تحریک لبیک پاکستان اور دیگر دھڑوں کی مخالفت کے باوجود انھیں فروری 2016 کو اڈیالہ جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

یہی پھانسی ٹی ایل پی کے پہلے بڑے احتجاج کی وجہ بنی۔ ممتاز قادری کی تدفین کا عمل مکمل ہوتے ہی ملک بھر کے مختلف شہروں میں اس پھانسی کے خلاف احتجاج شروع ہوا اور کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور میں اجتماعات و مظاہرے ہوئے جن میں خادم رضوی کی تحریک پیش پیش رہی۔

خادم رضوی نے اسلام آباد کے ڈی چوک میں ایک دھرنا دیا جو پُرتشدد ہو گیا۔

پولیس رپورٹس کے مطابق اس احتجاج کی وجہ سے اسلام آباد ایکسپریس وے بند رہی اور فیض آباد کے پل کو بند کر کے گاڑیوں پر پتھراؤ کیا گیا، اس تشدد آمیز احتجاج کے دوران توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کے واقعات ملک کے دیگر حصوں میں بھی رونما ہوئے۔

27 مارچ 2016 کوممتاز قادری کے چہلم کے موقع پر بھی راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ہی لوگ جمع ہوئے اور ایک بار پھر پُرتشدد احتجاجی واقعات رونما ہوئے۔

اس تمام عرصے میں بھی خادم رضوی کی تحریک لبیک اُن کے سخت گیر موقف اور کٹر رجحانات اور مستقل جاری رہنے والی شعلہ بیانی کی بنیاد پر مسلسل عوامی پذیرائی حاصل کرتی رہی۔

اس کے بعد اکتوبر 2017 کے اوائل یعنی مسلم لیگ (ن) کے وزیراعظم شاہد خاقان عباسی کے دور میں الیکشن ایکٹ 2017 میں ترامیم کے معاملے پر ایک پارلیمانی تنازع پیدا ہوگیا۔ اُن میں سے ایک شق انتخابی امیدواروں کے ختمِ نبوّت پر یقین رکھنے کے حلف نامے سے متعلق تھی۔

متنازع ترامیم کے تحت جب بعض الفاظ کے ردو بدل کا معاملہ سامنے آیا توحکومت نے اسے غلطی سے تعبیر کیا جبکہ حزب اختلاف نے سیاسی موقع غنیمت جان کر معاملے کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کردیا۔

اگرچہ حزب اختلاف کی نشاندہی پر حکومت نے ترامیم کے مسوّدے و متن کو پرانے الفاظ میں ہی بحال کردیا مگر خادم رضوی اور اُن کی جماعت نے اسے ایک 'بڑی سازش کا حصّہ' قرار دیتے ہوئے الزام عائد کیا کہ حکومت نے اس شق کا متن جان بوجھ کر بدلنے کی کوشش کی اور اس کے ذمہ دار (اس وقت کے) وزیر قانون زاہد حامد ہیں۔

خادم رضوی اور اُن کی تحریک نے وزیر قانون کے استعفے کا مطالبہ کردیا اور دھمکی دی کہ اگر مطالبہ نہ مانا گیا تو وہ اسلام آباد میں دھرنا دے دیں گے۔

مطالبہ پورا نہ ہونے پر تحریک لبیک نے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنایا اور آٹھ نومبر 2017 کو خادم رضوی کے حامی مظاہرین نے اسلام آباد کو راولپنڈی سے ملانے والی شاہراہ بند کردی اور ٹریفک معطل ہونے سے ایک نومولود بچّے کی جان چلی گئی۔

16 نومبر کو وزیر قانون نے قومی اسمبلی میں بل پیش کیا جس کے تحت الیکشن ایکٹ میں متنازع ہوجانے والی ترامیم کو ختم کر کے پرانی شکل میں بحال کردیا گیا اور خود وزیر قانون کو بھی اس موقع پر ختمِ نبوّت کے اپنے عقیدے کا اظہار کرنا پڑا۔

اس تمام معاملات بالآخر 25 نومبر 2017 کو حکومت نے پولیس کے ذریعے دھرنا ختم کروانے کی کوشش کی اور اس دوران ہونے والی جھڑپوں میں دونوں جانب سے جانی نقصان کی اطلاعات آنے لگیں۔

کراچی اور لاہور میں کئی افراد کی ہلاکت کی اطلاعات آئیں اور ملک بھر خصوصاً پنجاب بھر میں مسلم لیگ نون کے رہنماؤں اور کارکنان کے گھروں پر بھی ہجوم حملے کرتے رہے۔

خادم رضوی کی یہ سیاسی فتح اور ان کی سیاسی طاقت تب درج ہوئی جب کشیدگی اور ہلاکتوں سمیت تمام جانی و مالی نقصان کے بعد بالآخر 27 نومبر کو فوجی قیادت کی مداخلت سے ہی فریقین کو پھر مذاکرات کی میز پر بٹھایا گیا اور ایک چھ نکاتی معاہدہ عمل میں آیا۔

اس معاہدے کے تحت وزیر قانون زاہد حامد نے استعفیٰ دیا، حکومت نے تحریک لبیک کے گرفتار کارکنوں کو بڑی تعداد کو رہا کردیا، متنازع بن جانے والے قانون کے مسودے کا متن بحال کردیا گیا اور تب بھی یہی لگا

کہ تحریک لبیک کے مطالبات کے آگے حکومت نے گھٹنے ٹیک دیے۔

تحریک لبیک، سنی تحریک اور دیگر کے ساتھ ہونے والے حکومت کے اس معاہدے میں سرکاری اور تحریری طور پر تسلیم کیا گیا کہ فوج نے اس معاہدے میں مرکزی کردار ادا کیا اور معاہدے میں جس پر جنرل فیض حمید کے بھی دستخط تھے یہ تحریر تھا کہ یہ جنرل باجوہ اور اُن کے نمائندے کی خصوصی کوشش سے طے پایا۔

اس دھرنے کے اختتام پر رینجرز کے ایک اعلیٰ عہدیدار کی مظاہرین میں رقم تقسیم کرنے کی ویڈیو بھی منظرِ عام پر آئی، جس کا ذکر آگے چل کر سپریم کورٹ کے جسٹس قاضی فائزعیسیٰ کے فیصلے میں بھی آیا۔

اس فیصلے میں فوج اور اس کے خفیہ اداروں کو واضح نام لے کر تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے دائرہ کار اور آئینی کردار تک محدود رہیں اور اس سے تجاوز نہ کریں۔

دراصل تحریک لبیک کو صحیح معنوں میں سیاسی شکل اسی احتجاج کے بعد مل گئی تھی۔

19 نومبر 2020 کی شام تحریک لبیک کے بانی امیر مولانا خادم حسین رضوی ایک ہنگامہ خیز اور شہرت و تنازعات سے بھرپور زندگی گزار کر محض چند روزہ معمولی بیماری کے بعد 54 برس کی عمر میں لاہور میں وفات پا گئے۔

انھیں لاہور کی مسجدِ رحمت اللعالمین' کے 'مدرسۂ ابوذر غفاری' کے احاطے میں دفن کیا گیا اور 21 نومبر 2020 کو ان کے صاحبزادے سعد حسین رضوی کو ان کا جانشین اور تحریک کا دوسرا امیر مقرر کردیا گیا۔

اپنے والد اور پیشرو خادم رضوی کی طرح سعد حسین رضوی نے بھی احتجاج کا راستہ ہی اپنایا۔

تحریکِ لبیک کی احمدیوں اور دیگر اقلیتوں کے خلاف کارروائیاں، مقدمے اور پولیس کی جانب سے چھوٹ

تحریک لبیک پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی نہ صرف توہینِ مذہب کے قانون کے حق میں پیش پیش رہی بلکہ اس پر ملک میں احمد کمیونٹی کے خلاف پرتشدد اقدامات کرنے کے الزامات بھی لگتے رہے ہیں۔

پاکستان اور اس کے زیرِ انتظام کشمیر میں اس جماعت کے کارکنان نے احمدی برادری کے اراکین کے خلاف درجنوں مقدمات درج کروائے۔

کچھ واقعات میں احمدی کمیونٹی بھی ٹی ایل پی کے مقامی عہدیداران اور ٹکٹ ہولڈروں کے خلاف مقدمات درج کروانے میں کامیاب ہوگئی ہے، تاہم احمدی کمیونٹی مقدمات میں نامزد ہونے والے ٹی ایل پی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو عدالتوں سے سزائیں نہ ملنے کا شکوہ کرتی ہے۔

دو ماہ قبل ہی پنجاب کے شہر فیصل آباد کے کرتار پور نامی گاؤں میں احمدیوں کی دو عبادت گاہوں پر حملہ کیا گیا تھا۔ اس حملے کے بعد ٹی ایل پی کارکنان کے خلاف دو مقدمات درج کیے گئے تھے جن میں 47 افراد کو نامزد کیا گیا تھا اور 300 افراد کو نامعلوم ظاہر کیا گیا تھا۔

ان مقدمات میں 27 افراد کو گرفتار کیا گیا تھا جن میں سے چار ضمانت کے بعد رہا ہوگئے تھے۔

اس کے اگلے ہی ماہ ایک احمدی خاتون کی تدفین پر شروع ہونے والا تنازع اس وقت شدت اختیار کر گیا جب سیالکوٹ میں احمدی شہریوں کے گھروں ڈیرے پر حملہ کیا گیا۔ ان پُرتشدد کارروائیوں میں چھ افراد زخمی ہوئے اور اس حملے کا مقدمہ 31 نامزد اور 300 نامعلوم ملزمان کے خلاف درج کیا گیا۔

سیالکوٹ پولیس ترجمان خرم شہزاد کے مطابق مقدمے میں نامزد 30 ملزمان کو گرفتار کرلیا گیا تھا جن میں سے 13 ملزمان شناخت پریڈ کے مرحلے میں مقدمے سے ڈسچارج ہوگئے اور یوں اب 17 ملزمان پولیس کی حراست میں ہیں اور جسمانی ریمانڈ پر ہیں۔

اس کے علاوہ ملک بھر میں عیدالاضحیٰ پر جانور قربان کرنے پر بھی اس جماعت کے اراکین احمدی شہریوں کے خلاف مقدمات درج کرواتی رہی ہے۔

تحریکِ لبیک پاکستان پر صرف احمدیوں کو ہراساں کرنے کا الزام ہی نہیں لگتا بلکہ اگست 2023 میں جڑانوالہ میں مسیحی برادری کے گرجا گھروں اور عبادت گاہوں پر حملوں کا الزام بھی اسی جماعت پر لگا تھا۔

پنجاب کے شہر جڑانوالہ دو سال قبل 16 اگست 2023 میں مسیحی آبادی پر حملوں اور جلاؤ گھیراؤ کے واقعات میں مشتعل ہجوم نے 19 گرجا گھروں اور مسیحی عبادت گاہوں کے علاوہ 86 مکانات کو آگ لگائی اور ان میں توڑ پھوڑ کی تھی، جس پر 128 ملزمان کو گرفتار کیا گیا اور پانچ مقدمات درج کر کے ملزمان کے خلاف دہشت گردی، جلاؤ گھراؤ اور مذہبی عبادت گاہوں کی توہین کی دفعات لگائی گئیں۔

تاہم سانحہ جڑانوالہ کے دو برس گزر جانے کے باوجود متاثرین اب

بھی انصاف کے منتظر ہیں۔

فوجداری قوانین کے ماہر بلال شفیق جنجوعہ ایڈووکیٹ کہتے ہیں کہ مذہبی کارکنوں کے خلاف مقدمات کے اندراج کے باوجود ان کو سزائیں بہت کم ہوتی ہیں اس کی وجہ عدالتیں نہیں بلکہ پولیس کا پروسیکیوشن ڈیپارٹمنٹ اور حکومتوں کا کیس سرنڈر کرنا ہے۔

'پولیس مقدمات کا نامکمل چالان پیش کرتی ہے، ملزمان کو بروقت گرفتار نہیں کیا جاتا اور اگر گرفتار کرتے ہیں تو ٹھوس شواہد پیش نہیں کیے جاتے، شہادتیں قلمبند نہیں کروائی جاتیں۔ ایسے میں عدالت کس بنیاد پر فیصلہ کرے اور ملزمان کو کیسے سزا دے سکتی ہے۔'

ماضی اور موجودہ پابندی میں فرق

بی بی سی کے نامہ نگار روحان احمد ٹی ایل پی کو کافی عرصے سے کور کرتے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سنہ 2021 کی پابندی کے وقت مرکز اور صوبہ پنجاب دونوں میں عمران خان کی جماعت پی ٹی آئی کی حکومت تھی لیکن جو حکومتی ادارے تھے وہ اس پابندی کے حوالے سے ایک پیج پر نہیں تھے۔

روحان احمد کہتے ہیں کہ جب کسی جماعت پر پابندی لگ جاتی ہے تو وہ جلسے جلوس نہیں کر سکتی اور نہ ہی اپنی جماعت کے لیے فنڈز جمع کیے جا سکتے ہیں لیکن اگر ٹی ایل پی ایک بار پھر سڑکوں پر آنے کے قابل ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے پابندی نے اپنا کام نہیں کیا۔

لیکن ان کا ماننا ہے کہ ٹی ایل پی کی سٹریٹ پاور اب ماضی کے مقابلے میں اتنی نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹی ایل پی کی طاقت اس کے نعروں اور منشور سے جڑی ہے۔ ان کی سیاست ہمیشہ اس چیز کے ارد گرد گھومتی رہی ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ توہین مذہب یا توہین رسالت کے خلاف کھڑی دیوار ہیں۔'

روحان احمد کہتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی واقعہ ہو تو ممکن ہے کہ یہ جماعت لوگوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہو جائے لیکن اگر ان کے پاس کوئی ایسا موقع نہیں آتا تو یہ ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کو جمع کر کے اپنی سٹریٹ پاور کا مظاہرہ کر سکیں گے۔

تو کیا ٹی ایل پی کے حوالے سے ریاست کی پالیسی تبدیل ہو گئی؟

متعدد بار احتجاج کرنے والی اس جماعت کے خلاف حالیہ کریک ڈاؤن اور پابندی کیا ریاست کی بدلتی پالیسی کی جانب اشارہ ہے؟

صحافی اور تجزیہ کار احمد اعجاز کہتے ہیں کہ ریاست اپنی پالیسی میں تبدیلی لا رہی ہے اور اس کریک ڈاؤن میں ہمیں واضح اشارے ملے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ 'گذشتہ مظاہروں میں پولیس پیچھے ہٹ جاتی تھی یا یکسو نظر نہیں آتی تھی اور اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ جیسا کہ اگر ریاست کسی بھی موقف میں متزلزل ہوتی ہے تو نیچے حکومت متزلزل نظر آتی تھی۔ پھر اس پر عمل کرنے والے ادارے جیسے پولیس بھی متزلزل نظر آتی تھی لیکن اس بار اوپر سے لے کر نیچے تک پالیسی غیر متزلزل اور واضح نظر آئی۔ حکومتی عہدیداران نے میڈیا پر آ کر جو بیانات دیے، وہ واضح تھے۔'

احمد اعجاز مزید کہتے ہیں کہ 'پاکستان میں 2018 اور خاص کر کے 2022 کے بعد جو ہائبرڈ نظام تشکیل پایا، اس میں ریاست کو اب کسی بھی پریشر گروپ کی ضرورت نہیں رہی جیسے ماضی میں رہتی تھی۔'

پارلیمانی اثر و رسوخ اور کامیابی

ستمبر 2017 میں جب (سابق) وزیر اعظم نواز شریف کو نااہل قرار دیا گیا اور اس بنیاد پر نواز شریف کے حلقہ انتخاب این اے 120 لاہور کے ضمنی انتخاب منعقد ہوئے تب تک تحریک لبیک سرکاری طور پر باقاعدہ سیاسی جماعت (رجسٹر) نہیں تھی مگر پھر بھی تحریک لبیک نے اس ضمنی انتخاب میں حصہ لیا۔

تحریک کے حمایت یافتہ آزاد امیدوار شیخ اظہر حسین رضوی نے 7130 ووٹ لے کر سیاسی حلقوں اور ریاستی حکام کو حیرت زدہ کر دیا۔

الیکشن کمیشن کے ریکارڈ کے مطابق 26 اکتوبر 2017 کو جب پشاور سے قومی اسمبلی کے حلقہ این اے چار پر ضمنی انتخاب ہوا تو تحریک لبیک کے حمایت یافتہ امیدوار نے 9935 ووٹ حاصل کیے۔

پاکستان میں شدت پسندی اور مذہب سے جڑی عسکریت پسندی اور انتہا پسند فرقہ وارانہ عزائم کے بارے میں تحقیق کرنے والے ایک ادارے کے سربراہ اور معروف محقق عامر رانا کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ تحریک صرف ایک صوبے (پنجاب) تک محدود تھی۔۔۔ بلوچستان کے کوئٹہ، خضدار اور مکران جیسے علاقوں میں بھی ان کا سیاسی وجود قائم ہو چکا تھا۔'

قریباً 10 ماہ بعد پاکستان میں 2018 کے عام انتخابات 25 جولائی کو منعقد ہوئے اور تحریک لبیک نے ان میں بھی بطور سیاسی جماعت شرکت کی اور مجموعی طور پر 22 لاکھ کے لگ بھگ ووٹ حاصل کر کے ملک کی پانچویں اور پنجاب کی تیسری بڑی سیاسی قوت بن کر ابھری۔

تحریک لبیک اور خادم رضوی جو پنجاب میں بہت مقبول و فعال اور متحرک تھے حیرت انگیز طور پر پنجاب سے قومی یا صوبائی اسمبلی کی تو کوئی نشست نہ جیت سکے مگر ان کی جماعت نے عام انتخابات میں سندھ کی صوبائی اسمبلی کی دو براہ راست اور ایک مخصوص نشست سمیت تین نشستیں حاصل کر لیں۔

2024 کے عام انتخابات میں ٹی ایل پی کو ملک بھر سے تقریباً 29 لاکھ ووٹ ملے جو 2018 کے الیکشن سے تقریباً ساڑھے سات لاکھ زیادہ تھے۔

گیلپ سروے کے مطابق 2024 کے الیکشن میں پی ٹی آئی کو ایک کروڑ 80 لاکھ سے زیادہ ووٹ ملے اور مسلم لیگ نون کو تقریباً ایک کروڑ 40 لاکھ ووٹ ملے۔

ٹی ایل پی کے ان 29 لاکھ ووٹوں نے ان قوتوں کی کیسے مدد کی، جو ان انتخابات پر اثر انداز ہونا چاہتے تھے؟

اس حوالے سے بی بی سی کے روحان احمد کہتے ہیں کہ پی ٹی آئی حکومت کو کہیں نہ کہیں یہ خدشہ تھا کہ ٹی ایل پی پر پابندی انھیں سیاسی نقصان پہنچا سکتی ہے کیونکہ 2018 کے الیکشن میں نون لیگ زیر عتاب تھی اور ان کے رہنما بتایا کرتے تھے کہ ٹی ایل پی کو ان کا ووٹ بینک تقسیم کرنے کے لیے بنایا گیا۔'

ماہرین کے مطابق 2021 میں ٹی ایل پی پر پابندی اور سات ماہ بعد یہ پابندی ہٹ جانے کے بعد اسے ملک کے سیاسی منظر نامے میں کسی حد تک سٹیک ہولڈر بننے کا موقع ملا۔

ٹی ایل پی صرف اپنے حامیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ مین سٹریم سیاسی جماعتوں کے لیے بھی اہم ہو گئی۔ خاص کر کے پنجاب میں ٹی ایل پی اپنے ووٹوں کی وجہ سے مین سٹریم جماعتوں کی کامیابی یا ناکامی کا سبب بنے لگی۔

2024 کے انتخابات سے قبل پی ٹی آئی کی جانب سے ٹی ایل پی سے الائنس یا اتحاد کی بات ہوئی۔ مختلف انتخابات میں پی ٹی آئی اور مسلم لیگ نون کی مقامی سطح پر ٹی ایل پی کے ساتھ بات چیت ہوتی رہی ہے۔

اس سب سے پاکستانی سیاست کے بارے میں جو بات واضح ہے وہ یہ کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں معاشرے کو شدت پسندی سے پاک کرنے کی باتیں تو کرتی ہیں لیکن انتخابات جیتنے کے لیے اکثر ایسے گروہوں کا سہارا بھی لیتی ہیں۔

کیا حالیہ پابندی سے ٹی ایل پی پر کوئی اثر پڑے گا؟

تو کیا حالیہ پابندی سے ٹی ایل پی پر کوئی اثر پڑے گا؟ اور کیا اس وقت اس جماعت کی سیاسی مقبولیت یا سٹریٹ پاور اتنی ہے کہ وہ اس پابندی سے نمٹ سکے؟

احمد اعجاز کہتے ہیں کہ ٹی ایل پی کی تشکیل ایک دہائی کے اندر ہوئی۔ 'اس سے پہلے ان کے مرکزی لیڈرز زیادہ نمایاں نہیں تھے۔ اس جماعت کی مقبولیت صحیح معنوں میں سماجی ارتقا کے نتیجے میں نہیں تھی۔ جو چیزیں ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہیں، ان کو معاشرے میں پنپنے کا نہ تو وقت ملتا ہے، نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔'

وہ کہتے ہیں کہ 'ہماری ریاست نے مختلف جماعتوں کو اپنی پراکسی کے طور پر استعمال کیا لیکن جب اس پراکسی کی ضرورت نہ رہی تو ایسی جماعت کا اختتام ہم نے بہت بے دردی کے ساتھ بہت جلدی ہوتے دیکھا۔'

احمد اعجاز مزید کہتے ہیں کہ 'یہ سمجھ لینا کہ کوئی سیاسی جماعت اپنی جڑیں بنا چکی ہے، اس نے 30 لاکھ ووٹ لے لیے، تو وہ کوئی دس بیس یا 25 ہزار لوگوں کو باہر نکال لے گی، تو یہ سب اس لمحے پر منحصر ہوتا ہے۔

'اور اگر ریاست اس لمحے سرپرستی نہ کرے تو ایسا ممکن نہیں۔

عاصم رحمانی چلا گیا

صحافتی ضمیر کی تدفین!!

تحریر: عرفان ساگر

یہ شہر روشنیوں کا، خبروں کا، اور تصویروں کا شہر ہے۔ مگر ان روشنیوں کے پیچھے جو لوگ اپنی آنکھوں کی بینائی جلا دیتے ہیں، وہی ہمیشہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ عاصم رحمانی بھی انہی میں سے تھا روزنامہ قومی اخبار کا سابق چیف فوٹوگرافر، کراچی پریس کلب، پی ایف یو جے، کے یو جے اور پیپ کا سینئر ممبر جو ہفتے کی شب مختصر علالت کے بعد ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ ڈینگی بخار نے کمزور کیا، گھر سے اسپتال جاتے ہوئے سانس ٹوٹ گئی۔

نمازِ جنازہ ملیر اے ون ایریا کی جامع مسجد قادریہ میں ادا ہوئی، تدفین ائیرپورٹ روڈ ماڈل کالونی قبرستان میں ہوئی۔ اور وہاں؟ نہ کوئی "تنظیمی لیڈر"، نہ قومی اخبار کا نمائندہ، نہ ہی صحافتی شعبے کے بڑے بڑے نام۔

بس چند فوٹوگرافر بھائی صدر پیپ محمد جمیل، سیکریٹری نعمان نظامی، سید اطہر حسین، فیصل مجیب، محمد بیگ، آصف راٹھور، عمران علی، شکیل قریشی، آصف حسن اور شاہ زیب جو اپنے ساتھی کے دکھ میں شریک ہوئے۔

فیض احمد فیض نے کیا خوب کہا تھا:

"ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد،
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد!"

یہ شعر عاصم رحمانی کی پوری زندگی کا خلاصہ ہے۔

جس ادارے کو اس نے جوانی دی، وہ ادارہ خاموش۔

جس پیشے کو اس نے خدمت سمجھ کر نبھایا، وہ پیشہ بے حس۔

قومی اخبار سے واجبات تک نہ ملے، اور مالکان نے تو تعزیت کے دو لفظ بھی ادا نہ کیے۔

بس ایک زاہد قریشی، جو ذاتی تعلق کی بنیاد پر جنازے میں پہنچا۔

اور اب آتے ہیں ان "ارب پتی دوستوں" پر وہی جن کے کاروباری لانچز، دعوتیں، محفلیں اور خوشیوں کے لمحات وہ کیمرے کی آنکھ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کرتا رہا۔ جنہیں وہ "بھائی" کہہ کر یاد کرتا تھا،

جنہوں نے کئی بار سب کے سامنے کہا، "عاصم ہمارا دوست ہے، ہمارا بھائی ہے!"

مگر جب اس بھائی کا جنازہ اٹھا...... تو کوئی نہیں آیا۔

نہ کوئی لگژری کار، نہ کوئی مصنوعی افسوس۔

شاید ان ارب پتیوں کے پاس وقت نہیں تھا یا شاید غمِ دوست ان کے کیلنڈر میں فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔

واہ ری دنیا! کوئی اچھی تصویر بنائے تو "فوٹو بائی لائن" ملتی ہے لیکن جب وہ مر جائے تو کہنے کو ایک لائن بھی نہیں ملتی۔

جون ایلیا نے کہا تھا:

"میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس،
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں!"

یہی کیفیت عاصم رحمانی کی تھی۔

دیانت، خلوص، محنت سب کچھ اس نے دیا۔

مگر بدلے میں ملا صرف سکوت۔

کراچی پریس کلب، پی ایف یو جے، کے یو جے، پیپ سب تنظیموں کی فہرست میں اس کا نام درج تھا،

مگر کسی نے جنازے میں آنا گوارا نہ کیا۔ ہاں، فوٹوگرافرز موجود تھے، وہی جنہیں صحافت کا سب سے نچلا طبقہ سمجھا جاتا ہے لیکن جب انسانیت کی بات آتی ہے تو یہی نچلا طبقہ سب سے اوپر نکل جاتا ہے۔

ناصر کاظمی نے کہا تھا:

"دل تو اپنا اداس ہے ناصر، شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے"

ہاں، آج کراچی واقعی سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کیونکہ ایک فوٹوگرافر کا جنازہ اٹھ رہا تھا اور کیمروں کی چمک بجھ چکی تھی۔ یہ واقعہ ایک فرد کی موت نہیں، یہ صحافتی ضمیر کی تدفین ہے۔ عاصم رحمانی چلا گیا، مگر ایک سوال چھوڑ گیا: کیا ہم واقعی صحافت کرتے ہیں یا صرف مفادات کی تصویریں کھینچتے ہیں؟

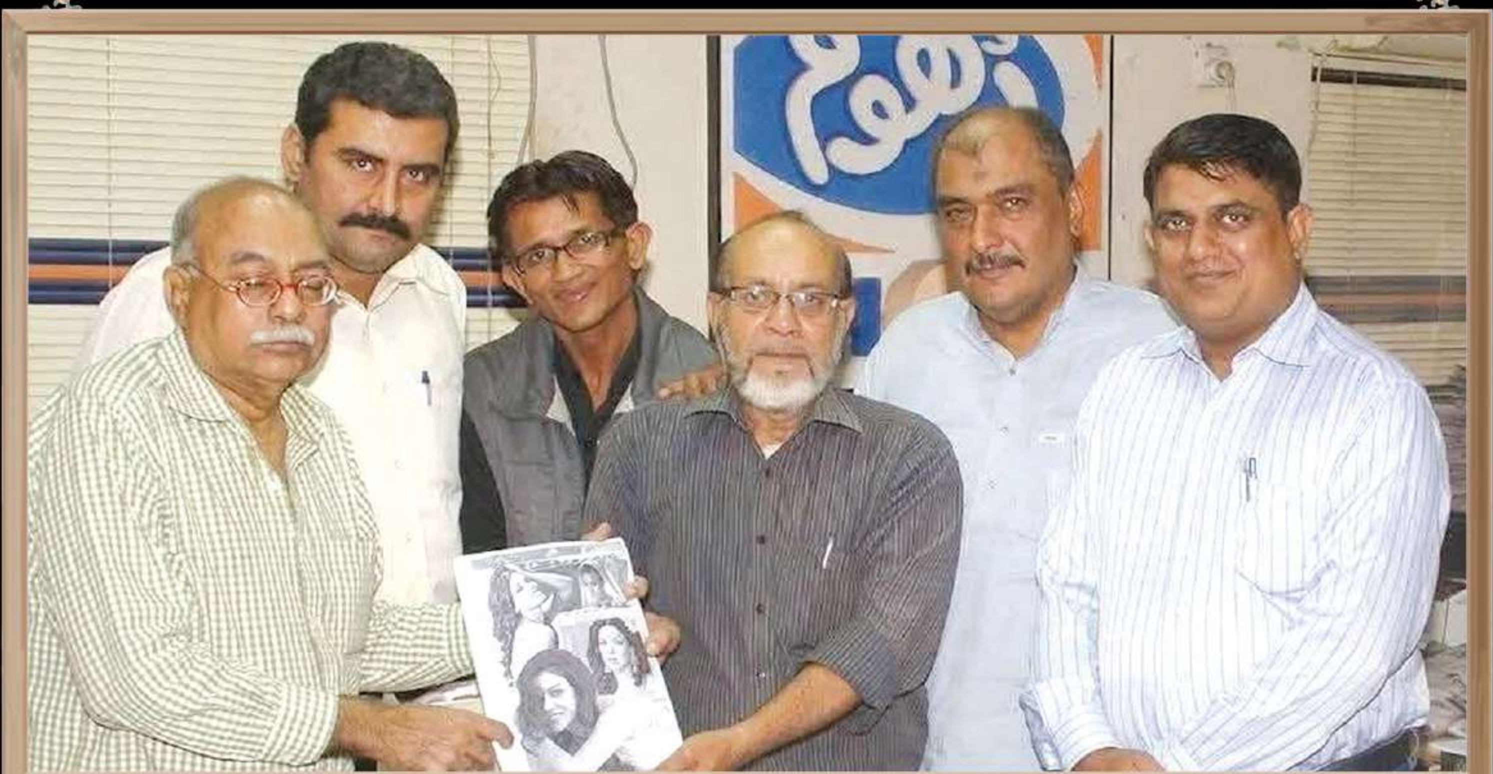

ہم زندہ تو بچ گئے، مگر پہلے جیسے نہیں رہے

فائر بندی ہوئی تو دو سال میں پہلی بار ایسا لگا کہ شاید ہم آزادی سے سانس لے سکیں، سکون سے سو سکیں اور کھلے دل سے خواب دیکھ سکیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا

جب میں یہ سطور تحریر کر رہی ہوں، تو یہ نام نہاد فائر بندی کا 13 واں دن ہے۔ نو اکتوبر کو اس معاہدے کے نافذ ہونے کے بعد سے اسرائیل نے اسے کئی بار توڑا ہے اور جب بھی چاہا، واپس اسی پر لوٹ آیا۔ یہ فائر بندی صرف کاغذوں تک محدود ہے۔

غزہ کی زمینی حقیقت مختلف ہے، جہاں اب بھی خوف ہم پر راج کر رہا ہے اور کچھ نہیں بدلا۔ یہاں سرحدیں بند ہیں، کھانے پینے کی اشیا کی مقدار محدود ہے اور ہر وہ چیز جس سے غزہ کے لوگوں کو ذرا سا سکون مل سکے، اسرائیل کی طرف سے روکی جا رہی ہے۔ جب تک یہ سب نہیں بدلتا، تب تک ہم حقیقی امن محسوس نہیں کر سکتے۔

میں ان چند لمحوں کو یاد کرتی ہوں جب فائر بندی ہوئی تھی اور لوگ خوشی سے 'جنگ ختم ہو گئی، جنگ ختم ہو گئی' کے نعرے لگا رہے تھے۔

لیکن میں نے اس وقت بھی یقین نہیں کیا۔ ہم نے سیکھا ہے کہ امید پر جلدی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ پھر بھی دو سال میں پہلی بار ایسا لگا کہ شاید ہم آزادی سے سانس لے سکیں، سکون سے سو سکیں اور کھلے دل سے خواب دیکھ سکیں۔

اعلان کے بعد ہم خاموش بیٹھے تھے، سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ خوش ہوں یا روئیں۔ جو ہم نے کھویا ہے، وہ ہمارے دلوں سے بڑا ہے۔ ہم تقریباً بھول چکے تھے کہ ایک عام دن کیسا ہوتا ہے۔ یہ دو سال کافی تھے ہمیں یہ یقین دلانے کے لیے کہ شاید ہم خوشی کے قابل ہی نہیں رہے۔

بعد میں، میں غزہ کی گلیوں میں نکلی اور اپنی زندگی کی سب سے خوبصورت تصویریں بنائیں۔ آسمان سے بم نہیں گر رہے تھے، کوئی نیا شہید نہیں تھا، ہمارے بھرے ہوئے ہسپتالوں میں کوئی زخمی نہیں پہنچ رہا تھا۔ ہم سب یہی کہہ رہے تھے، 'ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ عید کا پہلا دن ہو۔'

مگر حقیقت پسندی ضروری ہے۔ اس اختتام کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنا دکھ بھول جائیں گے۔ ہمارے شہر سے باہر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ ہم نے کیا جھیلا ہے۔ اس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ ہماری اپنی زندگی، ہمارا احساسِ تحفظ اور ہمارا مستقبل تھا۔ میری زندگی اس جنگ میں ناقابلِ بیان دکھ سے گزر چکی ہے۔

میں قحط کے دو ادوار سے گزری، ایک جنوری سے مارچ 2024 تک شمالی غزہ میں اور دوسری مارچ سے جولائی 2025 تک۔ ہم نے دنیا سے کھانے کی بھیک مانگی۔ آج بھی وہ راتیں یاد ہیں جب بھوک کے درد سے رو رو کر سو جاتی تھی۔ یہ وہ خالی پن تھا جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔ زندگی میں پہلی بار میں واقعی بھوکی تھی۔

مگر اسرائیلی ٹینکوں کا مکمل محاصرہ اس سے بھی بدتر تھا۔ جنگ شروع ہونے کے صرف دو ماہ بعد ہم اپنے گھر میں محصور ہو گئے، وہی جگہ جو آج بھی میرے دل میں بسی ہے، جہاں لوٹنے کی خواہش ہے۔ جب فضائی حملے ہمارے محلے پر برس رہے تھے ہمارے 30 رشتہ دار اس چھوٹے سے مکان میں دبکے بیٹھے تھے۔ ہم بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم نے سوچا یہی ہمارا انجام ہے۔

بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سب خوف سے رو رہے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے ضروری ہر چیز ختم ہو گئی تھی، نہ کھانا، نہ پانی، نہ بجلی، نہ انٹرنیٹ جس سے کسی کو اطلاع دے سکیں۔ تین دن تک بند رہنے کے بعد ہم سوتے اور جاگتے، بس یہی سوچتے کہ ہم ابھی تک زندہ کیسے ہیں۔

جنگ نے مجھے شروع کے مہینوں ہی میں بدل دیا۔ میں 19 سال کی تھی جب یہ شروع ہوئی اور جب یہ ختم ہوئی تو میں 21 برس کی ہوں، ہمیشہ کے لیے بدل چکی تھی۔ پرانی سارہ اب نہیں رہی۔ مجھے یاد ہے میرے والد نے کہا تھا: 'اگر میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو اپنی ماں اور بہن بھائیوں کا خیال رکھنا۔' بعض اوقات ہم خود بھی اپنے اندر کے دکھ کو سمجھ نہیں پاتے۔

غزہ کے ہر شخص کے دل میں ایک ایسی جنگ برپا ہے، جس میں بم نہیں پھٹتے مگر جو ہمیشہ لڑی جائے گی اکیلے، خاموشی سے۔

اس جنگ کا نفسیاتی اثر اتنا گہرا ہے کہ اس نے ہمارے خوابوں کا مفہوم ہی بدل دیا ہے۔ اب ہم صرف زندہ رہنے کے بارے میں سوچتے ہیں، کھانے، چھت اور حفاظت کے بارے میں۔ جنگ نے ہم سے خوشی کا احساس ہی چھین لیا ہے۔

اب بھی، فائر بندی کے بعد، سب کچھ عجیب لگتا ہے۔ جیسے امن ہم پر جچتا نہیں۔ ہمیں فطرت کی آوازیں قبول نہیں ہوتیں۔ ہم خاموشی سے چونک جاتے ہیں۔ ہم اسرائیلی ڈرونز کی بھنبھناہٹ کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ان کے بغیر فضا اجنبی لگتی ہے۔

گذشتہ رات، نیند نہ آنے پر، میں اپنے خاندان کے پناہ گزین خیمے سے باہر نکلی اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ میرا جسم اب بھی ہر آواز میں خطرہ تلاش کرتا ہے۔ جب احساس ہوا کہ جو آواز مجھے چونکا رہی تھی، وہ دراصل بحیرۂ روم کی لہروں کی تھی جو ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، تو برسوں بعد دل میں ایک خوشی سی جاگی۔

فطرت کی آواز سن کر خوشی ہوئی، مگر اداسی بھی کیونکہ میں بھول چکی تھی کہ یہ احساس کیسا ہوتا ہے۔ میں نے اس معمول کی کیفیت کو بہت یاد کیا تھا۔

میں وہ سارہ نہیں رہی جو اس جنگ میں داخل ہوئی تھی۔ مستقبل اب بھی خاموشی میں معلق ہے مگر میں زندہ ہوں۔ شاید فی الحال یہی کافی ہے۔

'گریٹر بنگلہ دیش' کے مبینہ نقشے پر وضاحت: جنرل ساحر شمشاد کو عبوری حکومت کے سربراہ محمد یونس کی جانب سے دیا گیا تحفہ متنازع کیوں ہوا؟

بنگلہ دیش کی حکومت نے انڈین میڈیا پر شائع ہونے والے اُن رپورٹس کی تردید کی ہے جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ عبوری حکومت کے سربراہ محمد یونس نے حالیہ ملاقات کے دوران پاکستان کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل ساحر شمشاد مرزا کو جو کتاب بطور تحفہ دی تھی اُس کے سرورق پر موجود بنگلہ دیش کے نقشے میں انڈیا کے چند حصوں کو شامل کیا گیا ہے۔

اپنے بیان میں بنگلہ دیش کی عبوری حکومت نے وضاحت کی ہے کہ ساحر شمشاد مرزا کو دی گئی کتاب کے 'سرورق پر موجود نقشہ گرافٹی انداز میں بنایا گیا ہے، اس لیے کچھ لوگ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں بنگلہ دیش کے اصل نقشے سے معمولی فرق ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کہ اس میں انڈیا کے شمال مشرقی علاقے کو شامل کیا گیا ہے، بالکل جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔'

یاد رہے کہ پاکستان کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل ساحر شمشاد مرزا بنگلہ دیش کے دورے پر تھے اور اسی سلسلے میں انھوں نے 25 اکتوبر (سنیچر) کی شام عبوری حکومت کے سربراہ محمد یونس سے ملاقات کی تھی۔

اس ملاقات کے موقع پر لی گئی کئی تصاویر عبوری حکومت کے سربراہ محمد یونس کے آفیشل سوشل میڈیا اکاؤنٹس سے جاری کی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ ملاقات کے دوران 'بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان تعلقات سے متعلق وسیع تر امور پر تبادلہ خیال کیا گیا، جن میں دوطرفہ تجارت، سرمایہ کاری اور دفاعی تعاون' شامل ہیں۔ اِسی ملاقات کے دوران جنرل ساحر شمشاد مرزا کو محمد یونس کی جانب سے وہ کتاب تحفتاً پیش کی گئی جس پر انڈیا میں بہت سے صارفین کو اعتراض ہوا۔

اس کتاب سے متعلق بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کی جانب سے بتایا گیا ہے کہ 'ڈاکٹر محمد یونس نے پاکستانی جنرل کو 'دی آرٹ آف ٹرایمف' کے عنوان سے ایک کتاب تحفے میں دی، جس میں (بنگلہ دیش میں) جولائی 2024 کی عوامی بغاوت کے دوران ملک بھر کی دیواروں پر طلبا کی جانب سے بنائے گئے رنگ برنگے اور متنوع گرافٹی فن پارے شامل ہیں۔'

مزید کہا گیا کہ 'یہ مجموعہ جولائی (2024) کی بغاوت پر مبنی ایک تصویری دستاویزی کتاب ہے، جو طلبا اور عوام کی قربانیوں سے حاصل کی گئی انقلابی تحریک کی تاریخی جھلکیاں پیش کرتی ہے۔'

اس کتاب کے سرورق پر بنگلہ دیش کا خون سے رنگا نقشہ دکھایا گیا ہے جو کہ ایک معروف گرافٹی ہے، تاہم اس پر انڈیا کی جانب سے شدید ردعمل سامنے آیا ہے۔

انڈین میڈیا کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب کے سرورق پر بنگلہ دیش کا جو نقشہ موجود ہے اس میں انڈیا کی شمال مشرقی ریاستوں کے بعض حصوں کو بنگلہ دیش کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ انڈین سرکاری ٹیلی ویژن دوردرشن پر پیش کیے جانے والے ایک پروگرام میں الزام عائد کیا گیا کہ بنگلہ دیش میں طلبا کی بغاوت کے بعد انڈیا مخالف سرگرمیاں ہو رہی ہیں۔

اسی پروگرام میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ اب بنگلہ دیش میں 'انڈیا کے مخالفین کا پرتپاک استقبال' کیا جا رہا ہے اور انھیں ایک انتہائی متنازع کتاب اور نقشہ تحفے میں دیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ محمد یونس یہ کتاب اب تک 12 سے زیادہ ممالک کے سربراہان مملکت کو تحفے میں دے چکے ہیں جو کہ ایک بڑا سفارتی اشارہ ہو سکتا ہے۔ تاہم عبوری حکومت نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ 'محمد یونس یہ کتاب اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل، سابق امریکی صدر جو بائیڈن، اور کینیڈا کے وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو سمیت کئی عالمی رہنماؤں کو تحفے میں دے چکے ہیں۔'

یاد رہے کہ بنگلہ دیش میں شیخ حسینہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد سے تعلقات کشیدہ ہیں۔ اپنی حکومت کے خاتمے کے بعد شیخ حسینہ فرار ہو کر انڈیا چلی گئی تھیں اور فی الحال وہیں مقیم ہیں۔

انڈیا کا نقشوں سے متعلق اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ تنازع نیا نہیں ہے۔ گذشتہ سالوں میں نیپال کے ساتھ بھی نقشے کے متعلق تنازع سامنے آیا تھا جبکہ پاکستان اور چین کے ساتھ تو ایک متنازع سرحد اُن کے درمیان جھڑپوں کا باعث بھی بنی رہی ہے۔

شمشاد مرزا اور محمد یونس کی ملاقات کے دوران کیا ہوا؟

محمد یونس کے سوشل میڈیا ہینڈل سے ملاقات کی تفصیلات جاری کی گئی ہیں۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے دورے پر آئے ہوئے پاکستان کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل ساحر شمشاد مرزا نے سنیچر (25 اکتوبر) کو رات گئے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس 'جمنا' میں چیف ایڈوائزر پروفیسر محمد یونس سے رسمی ملاقات کی۔

بیان کے مطابق 'ملاقات کے دوران، انھوں نے بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان تعلقات سے متعلق وسیع تر امور پر تبادلہ خیال کیا، جن میں دوطرفہ تجارت، سرمایہ کاری اور دفاعی تعاون کی بڑھتی ہوئی اہمیت شامل ہے۔'

'دونوں ممالک کے درمیان مشترکہ تاریخی، ثقافتی اور عوام کے درمیان تعلقات پر زور دیتے ہوئے جنرل مرزا نے متعدد شعبوں میں تعاون کو مضبوط بنانے کی پاکستان کی خواہش کا اظہار کیا۔'

اس بیان میں مزید بتایا گیا کہ اس موقع پر جنرل مرزا نے کہا کہ 'دونوں ممالک ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کراچی اور چٹاگانگ کے درمیان دوطرفہ جہاز رانی کے راستے پر پہلے ہی کام شروع ہو چکا ہے، جبکہ ڈھاکہ سے کراچی کے درمیان ہوائی راستے کی آنے والے مہینوں میں کھلنے کی امید ہے۔'

'انھوں نے مختلف خطوں میں امن و استحکام کو نقصان پہنچانے کے لیے غیر ریاستی عناصر کی جانب سے غلط معلومات کے بڑھتے ہوئے چیلنج اور سوشل میڈیا کے غلط استعمال پر بھی تبادلہ خیال کیا۔'

نقشے پر تنازع اور وضاحت

اس ملاقات کی تصاویر سامنے آنے کے بعد انڈیا ٹوڈے کی ایک رپورٹ میں الزام عائد کیا گیا کہ انڈیا اور میانمار کے کچھ حصوں کے ساتھ ایک نام نہاد 'گریٹر بنگلہ دیش' دکھائے جانے والے متنازع نقشے کے پیچھے 'سلطنت بنگلہ' نامی تنظیم ہے۔

یاد رہے کہ سب سے پہلے اس کتاب پر موجود نقشہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں دکھایا گیا تھا، جس پر اتنا ہنگامہ ہوا کہ انڈیا کے وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے راجیہ سبھا (ایوان بالا) میں کانگریس کے رکن پارلیمنٹ رندیپ سنگھ سرجے والا کے سوال کے جواب میں ایک تحریری بیان جاری کیا۔

وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ 'حکومت ان تمام پیش رفتوں کی قریب سے نگرانی کر رہی ہے جن کا انڈیا کی قومی سلامتی سے تعلق ہے اور اس کی حفاظت کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔'

انھوں نے کہا تھا کہ 'حکومت نے ان رپورٹس کا نوٹس لیا ہے کہ ڈھاکہ میں ایک اسلام پسند گروپ 'سلطنت بنگلہ'، جسے ترکی کی ایک این جی او کی حمایت حاصل ہے، نے نام نہاد 'گریٹر بنگلہ دیش' کا نقشہ پیش کیا ہے جس میں انڈیا کے کچھ حصے شامل ہیں۔ یہ نقشہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں دکھایا گیا تھا۔'

بعدازاں بنگلہ دیش کی حکومت کے حقائق کی جانچ کرنے والے پلیٹ فارم 'بنگلہ فیکٹ' نے دعویٰ کیا ہے کہ بنگلہ دیش میں 'سلطنتِ بنگلہ' جیسی کسی تنظیم کے کام کرنے کے کوئی شواہد نہیں ہیں۔

یاد رہے کہ انڈیا اور بنگلہ دیش کے درمیان کوئی بھی زمینی تنازع نہیں ہے، جو تھوڑے بہت تنازعات رہے تھے وہ سنہ 1974 کے لینڈ باؤنڈری معاہدے اور اس کے بعد سنہ 2015 کے پروٹوکول کے ذریعے طے پا گئے تھے۔

ان معاملات پر اپنا ردعمل دیتے ہوئے بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کا کہنا ہے کہ '27 اکتوبر کو انڈیا ٹوڈے نے ایک رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ ڈاکٹر محمد یونس نے پاکستان کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل ساحر شمشاد مرزا کو ایک ایسا نقشہ پیش کیا جس میں بنگلہ دیش کے نقشے میں انڈیا کے شمال مشرقی علاقے کو بھی دکھایا گیا ہے۔ یہ دعویٰ بالکل غلط اور من گھڑت ہے۔'

اس بیان میں مزید کہا گیا کہ 'گرافٹی میں دکھائے گئے نقشے اور بنگلہ دیش کے اصل نقشے کا تقابلی جائزہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ یہ فن پارہ تقریباً مکمل طور پر بنگلہ دیش کے حقیقی نقشے کی عکاسی کرتا ہے۔'

بہرحال پاکستان کے چیف آف سٹاف اور عبوری حکومت کے سربراہ کی ملاقات کے بعد انڈین سوشل میڈیا پر بہت سے سوالات کیے جا رہے ہیں۔

ایک صارف نے لکھا کہ 'لیکن معاف کریں جناب، آخر پاکستان کا ایک جنرل ایک سول عہدیدار سے تجارتی تعلقات پر کیوں بات کر رہا ہے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔'

بہت سے صارفین بنگلہ دیش کا اصل نقشہ پوسٹ کر رہے ہیں جبکہ بہت سے کتاب کے سرورق پر موجود نقشے کی وضاحت کر رہے ہیں۔

حال ہی میں پاکستان افغانستان کے خلاف جنگ کی حالت میں تھا۔ افغانستان کی طرف سے ہمیں وہی پرانا منتر سننے کو ملا کہ 'افغانستان سلطنتوں کا قبرستان ہے'۔ سب سے پہلے تو پاکستان کوئی سلطنت نہیں جبکہ دوسری بات یہ کہ یہ خیال کسی افسانے سے کم نہیں۔

اگست 2021ء میں افغانستان سے امریکی افواج کے انخلا کے دوران سابق صدر جو بائیڈن نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ 'اب جو واقعات

ہم دیکھ رہے ہیں وہ افسوس ناک طور پر اس بات کا ثبوت ہیں کہ کوئی بھی فوجی قوت کبھی بھی ایک مستحکم، محفوظ افغانستان کو ممکن نہیں بنا سکتی جو تاریخ میں سلطنتوں کے قبرستان کے نام سے جانا جاتا ہے'۔

محقق الیگزینڈر رینی خلیلی اس سے متفق نہیں۔ انہوں نے لکھا، 'بائیڈن کی جانب سے افغانستان کو سلطنتوں کا قبرستان قرار دیا جانا تاریخی اعتبار سے ان کی کم علمی کو ظاہر کرتا ہے'۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اصطلاح کا تاریخی بیانیے یا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

الیگزینڈر رینی خلیلی کے مطابق یہ اصطلاح (افغانستان کے تناظر میں) 2001ء میں پہلی بار فارن افیئرز جریدے کے لیے سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی (سی آئی اے) پاکستان کے سابق اسٹیشن چیف ملٹن بیئرڈن کی جانب سے لکھے گئے ایک مضمون میں سامنے آئی تھی۔ اس مضمون کا عنوان ہی 'افغانستان: گریویارڈ آف ایمپائرز' (سلطنتوں کا قبرستان) تھا۔ ملٹن بیئرڈن کے مضمون سے پہلے اس جملے کے استعمال کے حوالے سے بہت کم شواہد موجود ہیں۔

2001ء میں جب امریکی افواج طالبان حکومت کو ختم کرنے اور سعودی شہریت رکھنے والے دہشت گرد اسامہ بن لادن کو تلاش کرنے کے لیے افغانستان پر حملے کی تیاری میں تھیں تب ملٹن بیئرڈن نے امریکی حکومت کو خبردار کرتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ تاریخ میں کئی بڑی افواج نے افغانستان پر قبضے کی کوشش کی لیکن انہیں بے رحم افغان قبائل کے ساتھ مقابلوں میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ملٹن بیئرڈن نے اس سلسلے میں یونانی بادشاہ سکندر اعظم کا نام لیا، خونخوار منگول جنگجو چنگیز خان، برطانوی سلطنت اور سوویت یونین کی مثالیں پیش کیں جنہیں افغانوں نے 'شکست' دی۔

لیکن الیگزینڈر رینی خلیلی کے مطابق، 'ملٹن بیئرڈن کی دلیل تاریخی حقائق سے بالکل متصادم ہے'۔ سکندر اعظم اور چنگیز خان نے نہ صرف افغانستان فتح کیا تھا بلکہ ان کے جان نشینوں نے ان کے بعد صدیوں افغانستان پر حکومت کی تھی۔ 'قبرستان' کا بیانیہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرتا ہے کہ بہت سی سلطنتیں جیسے ہخامنشی، کوشان، مغل اور دیگر نے طویل عرصے تک افغانستان کے بڑے حصوں پر کامیابی سے حکومت کی تھی۔۔

ہاں اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ 19ویں صدی میں برطانوی افواج کو افغانستان میں شکستوں کا سامنا کرنا پڑا (کابل فتح کرنے کے بعد) لیکن مجموعی طور پر برطانوی سلطنت کو اس سے بہت ہی کم نقصان پہنچا۔

1940ء کی دہائی کے وسط میں سلطنت کے ٹوٹنے تک وہ دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور ترین سلطنت کے طور پر قائم رہی۔ بنیادی طور پر وہ دوسری جنگ عظیم کے اثرات اور اس کے بعد ہونے والے نوآبادیات کے دور کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ افغانستان کا اس سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس کے باوجود بہت سے عسکری ماہرین اتفاق کرتے ہیں کہ افغانستان کو توڑنا آسان نہیں۔ تاہم اس حوالے سے ان کی رائے اکثر مبالغہ آمیز خیال پر مبنی نہیں ہے کہ افغانوں میں ایک 'افسانوی جنگی جذبہ' ہے جو سلطنتوں کو شکست دیتا ہے، اس کے بجائے ان کے خیالات رومانوی یا بہادری کے افسانوں سے نہیں بلکہ عملی فوجی و تزویراتی حقائق سے جڑے ہیں۔

لندن کے کنگز کالج میں دفاعی مطالعے کی تعلیم دینے والے پیٹرک پورٹر کے مطابق، افغانستان کی جغرافیہ ہی وہ وجہ ہے جو اسے فتح کرنے اور اسے کنٹرول کرنے کے لیے ایک مشکل ملک بناتی ہے۔ یہ پہاڑوں، صحراؤں اور انتہائی درجہ حرارت رکھنے والا ملک ہے جو نہ صرف جنگ لڑنے بلکہ لاجسٹک طور پر کام کرنے میں بھی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ یہ نقل و حرکت کو محدود کرتا ہے اور حملہ آور فوج کے لیے طاقت کا استعمال مشکل بناتا ہے۔

یہ جملہ کہ 'افغانستان سلطنتوں کا قبرستان ہے'، غالباً 1980ء کی دہائی میں افغانستان میں سوویت مخالف شورش کے دوران سی آئی اے کے رکن کے طور پر ملٹن بیئرڈن کے تجربات سے اخذ کیا گیا تھا۔ سی آئی اے اور پاکستان کی اہم انٹیلی جنس ایجنسی، آئی ایس آئی، دسمبر 1979ء میں افغانستان پر حملہ کرنے والے سوویت افواج کے خلاف لڑنے کے لیے افغان گروہوں (مجاہدین) کی مالی معاونت، انہیں مسلح کرنے اور تربیت دینے کے لیے مل کر کام کر رہے تھے۔

مجاہدین کو ان کی لڑائی کا جواز فراہم کرنے کے لیے بیانیہ اور وضاحتیں بھی دی گئیں۔ ان کی جدوجہد کو ایک 'ملحد حملہ آور' کے خلاف 'جہاد' اور اپنے ملک کو آزاد کرنے کی جنگ کے طور پر بیان کیا گیا۔ ان بڑے بیانیوں سے کئی چھوٹے بیانیے بھی ابھرے جو افغانوں کے 'تاریخی جنگجو جذبے' کے افسانوی تصورات پر مبنی تھے۔

امریکی اور پاکستانی حکومتوں نے ان تصورات کو مضبوط کیا۔ انہوں نے انہیں مضبوط بنانے کے لیے مقبول ثقافتی حربوں کا بھی استعمال کیا۔ اس کی مثال میں ہولی وڈ کی بلاک بسٹر فلم 'ریمبو 3' شامل ہے جبکہ پاکستان کا ٹی وی ڈراما 'پناہ' بھی اس سلسلے میں اہم ہے۔

1985ء میں پشاور میں شائع ہونے والا ایک پمفلٹ بھی اہم تھا جس میں ایک سوویت مخالف جہادی گروپ نے دعویٰ کیا تھا کہ مجاہدین نے سوویت ٹینکوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا ہے جبکہ وہ ٹینکوں کے سامنے کھڑے ہو کر 'اللہ اکبر' کے نعرے لگا رہے تھے'۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی اس افسانے پر یقین کر سکتا ہے کہ 'افغانستان سلطنتوں کا قبرستان ہے' کیونکہ یہ اس وقت گردش کرنے والے کئی چھوٹے بیانیوں میں سے ایک تھا۔ لیکن اس بیانیے کو 2001ء میں ملٹن بیئرڈن نے مین اسٹریم کا حصہ بنایا جس نے جلد ہی سوویت مخالف سورش میں اپنے قدم جما لیے۔ لیکن ایسے مبصرین بھی ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کہانی بھی افسانہ ہے کہ مجاہدین نے امریکی ہتھیاروں سے تنہا اپنے بل پر باآسانی سوویت افواج کو شکست دی تھی۔

2011ء میں اپنی کتاب Afgansty میں برطانوی سفارت کار روڈرک بریتھویٹ نے لکھا ہے کہ سوویت فوجیوں اور مجاہدین کے درمیان جنگ دراصل تعطل پر ختم ہوئی۔ سوویت فوج نے کامیابی سے بڑے شہروں اور انفرااسٹرکچر پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ مجاہدین شہر سے باہر کے علاقوں پر قابض تھے۔ روڈرک کے مطابق 1989ء میں سوویت انخلا، گھریلو سیاست اور فیصلہ کن فوجی شکست کے بجائے ایک مہنگی جنگ کو ختم کرنے کی خواہش کے مطابق عمل میں آیا تھا۔

'قبرستان' والا بیانیہ دو طریقوں سے کام کرتا ہے۔ طالبان نے 2000ء کی دہائی کی ابتدا میں اس کا استعمال شروع کیا جس سے وہ حملہ آوروں کو متنبہ کرتے تھے اور ناقابلِ تسخیر افغانستان کی افسانوی تصویر پیش کرتے تھے۔ دوسری جانب غیر افغان اس اصطلاح کا استعمال اپنی شکست کو معقول بنانے کی کوشش میں کرتے تھے کہ سب کو یہاں شکست ہوئی تھی تو ہم بھی اسی لیے ہارے ہیں۔ جو بائیڈن اپنی تقریر میں بالکل یہی کر رہے تھے۔

دونوں ہی اعتبار سے یہ تصور بہت سادہ سا ہے جس نے جغرافیائی سیاسی پیچیدگیوں کو جنم دیا ہے جبکہ افغانستان اور وہاں لڑی جانے والی تمام جنگوں کو نئی شکل دی ہے۔ سربیا کے مؤرخ نیمنجا جووانوویچ نے 2022ء میں نشاندہی کی کہ اگرچہ افغانستان کے پاس وسائل کم ہیں لیکن اس کے محل وقوع نے اسے ہزاروں سالوں سے تزویراتی طور پر ایک اہم مقام کی حیثیت دی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے طاقتوں نے یہاں حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیمنجا جووانوویچ نے تجویز دی کہ افغانستان کو 'سلطنتوں کا جنگی میدان' کہنا زیادہ درست رہے گا کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں بڑی طاقتیں خطے یا دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش میں آپس میں ٹکرائی ہیں۔

افغانستان سے سرگرم عسکریت پسندوں کی جانب سے پاکستان پر حملوں اور مبینہ طور پر بھارت کے حمایت یافتہ حملوں کو جنوبی ایشیا میں اُبھرتی ہوئی طاقت بننے کے لیے پاکستان کی بڑھتی ہوئی ساکھ کے لیے خطرے کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

کراچی (آغا خالد)

وہ سندھ کا ایک بھاری بھرکم نام تھے اور ان کے بڑوں نے قیام پاکستان میں قائداعظم کی مدد کی تھی، گڑھی یاسین کے شاہی خانوادہ سے تعلق رکھنے والے آغا سراج سندھ کے چند کروڑ پتی خاندانوں میں سے تھے مگر سیاست میں آنے کے بعد مملکت کے طاقت ور اداروں نے ان کے ساتھ بھی ایک سے زائد بار وہی گھناؤنا سلوک کیا جس کا مقصد سیاستدانوں کی کردار کشی اور ان کی رسوائی ہوتا تھا کبھی ان کے گھر یا دفتر سے کروڑوں روپیہ برآمد کروایا جاتا کبھی گڑھی یاسین کے محل کے صحن سے خزانہ برآمد ہوتا مگر ان کے خلاف بنائے گئے بیسیوں مقدمات کے عدالتی چالان میں وہ خزانے کبھی ظاہر نہ کیے جاسکے تبھی کہتے ہیں "جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے"

آغا سراج درانی دوستوں کے دوست مشہور تھے جبکہ ان کی اصل وجہ شہرت صدر مملکت آصف زرداری سے ان کی بچپن کی دوستی تھی وہ ذوالفقار مرزا کی طرح میٹرک سے زرداری کے کلاس فیلو بھی رہے

آغا سراج درانی بھی داغ مفارقت دے گئے

اناللہ وانا الیہ راجعون

- وہ گڑھی یاسین کا شہزادہ، پی پی کا پرجوش جیالا، آغا سراج درانی
- سرکار کے شدید دباؤ پر بھی زرداری کے خلاف وعدہ معاف گواہ نہ بنا
- پرجوش اور زندہ دل، فن کا شیدائی تھا، امریکہ میں ماڈلنگ بھی کی
- 2008 میں وہ سندھ کی وزارت اعلیٰ کے لیے مضبوط امیدوار تھا
- آصف زرداری نے انہیں وزارت اعلیٰ کے لیے نامزد کیا تھا
- مگر پھر اپنوں کی سازش کا شکار ہوگیا

اور بہت سے دوستوں کے بقول ان کی موت کی بڑی وجہ زرداری صاحب کا گزشتہ کئی برسوں سے ان کے ساتھ سرد رویہ بھی تھا جس کا انہیں صدمہ تھا اور وہ اپنے قریبی دوستوں سے ہلکے پھلکے انداز میں اس پر شکوہ بھی کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ اسی رویہ کے سبب وہ گزشتہ 10 برس سے کابینہ سے باہر رہے جبکہ انہیں یہ بھی شبہ تھا کہ طاقت ور عہدوں سے محروم رکھنے کی خاطر ہی انہی پانچ سال سندھ اسمبلی کا اسپیکر رکھا گیا وہ بلا کے ذہین قابل شریف النفس اور پی پی کے وفادار رہنما تھے ان کے قریبی اعزہ کا کہنا ہے کہ وہ بچپن سے سیاست سے الرجک تھے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے اور اپنے شوق کی تکمیل میں انہوں نے امریکہ میں ماڈلنگ بھی کی اور کچھ دیگر ڈراموں میں بھی چھوٹے موٹے رول کیے جس پر وہ گوریوں کے پسندیدہ اداکار مشہور ہوئے وہ دراز قد کے ساتھ کسرتی جسم، پرکشش نقوش، گھنگریالے بال، بڑی آنکھیں، نکھری رنگت اور نوکیلی رعب دار موچھوں کے ساتھ مردانہ وجاہت کا شاندار شاہکار تھے اس لیے امریکہ کے گوروں میں تیزی سے مقبول ہو رہے تھے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو 87/88 میں امریکہ گئیں تو انہوں نے اصرار کر کے انہیں واپس آنے اور سندھ کی سیاست میں کردار ادا کرنے پر آمادہ کرلیا کہا جاتا ہے کہ ایسا بھی محترمہ نے اپنے شوہر آصف زرداری کی سفارش پر کیا تھا وہ اکثر بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ جس روز میری فلائٹ کراچی میں اتری اسی روز جنرل ضیا کا جہاز بہاول پور میں حادثہ کا شکار ہوا تھا ان کے والد آغا صدر الدین درانی سندھ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر رہے جبکہ چچا آغا بدرالدین قیام پاکستان کے وقت سندھ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر تھے اور پاکستان سے الحاق کی سائیں جی ایم سید کی قرارداد میں پیش پیش تھے ان کا خاندان 3 صدیاں قبل افغانستان سے برصغیر آیا اور پھر محلہ آوروں کے ساتھ واپس جانے کی بجائے سندھ میں ہی ٹھہر گیا اور شکار پور اور جیکب آباد کے درمیان ایک چھوٹے سے مگر ترقی یافتہ قصبے گڑھی یاسین کو اپنا مسکن بنالیا ایک قلعہ نما چہار دیواری بنا کر پورا کنبہ اس میں رہائش پذیر ہوا یہ اصلی پٹھان اور لڑاکا قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اس مشکل علاقہ میں بھی جلد ہی ان کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ علاقہ کے بڑے زمیندار گھرانہ کی حیثیت سے مشہور ہوگئے مشکل علاقہ اس لیے کہا کہ شکار پور سے جیکب آباد تک زیادہ تر جنگجو لڑاکا بلوچ قبائل آباد ہیں 20 ویں صدی تک سرداروں کی سطح پر ان میں رشتہ داریاں بن رہی ہوتی تھیں مگر عین اسی لمحے نچلی سطح پر خونریز جھگڑے چل رہے ہوتے تھے جس میں ہر ایک جھگڑے میں 8/10 بندوں کا مرجانا تو معمولی بات تھی ایسے علاقہ میں دھاک کے ساتھ رہنا بذات خود بڑا کارنامہ تھا پھر درانی قبیلہ جنگجو اور لڑاکا بھی مشہور ہوگئے اور غیر اعلانیہ (معاشی اور ذہنی) سلطنت بھی قائم کرلی ہوا یوں کہ پھر علاقہ کی بڑے زمینداری کے علاوہ ان کی نئی نسل اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب ہوگئی جبکہ اس علاقہ کے طاقت ور بلوچ قبائل کے صرف سرداروں کے سکا دھلکا بچے ہی تعلیم حاصل کرتے تھے اور قبیلہ جہالت میں ڈوبا رہتا تھا مگر درانی بحیثیت قبیلہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے حکومتوں میں اہم مناصب حاصل کرتے رہے جس سے یہ مہذب بھی ہوگئے اور علاقہ میں ان کا اثر و رسوخ بھی بڑھتا گیا اس درانی قبیلہ کی 21 ویں صدی کے فرزند آغا سراج درانی ہونہار ہونے کے ساتھ اثر و رسوخ اور صوبہ سندھ کی سیاست میں منفرد مقام حاصل کر گئے ان کی ملن سار فقیرانہ عادات نے انہیں شکار پور سے نکال کر پورے سندھ کی مقبول شخصیت بنا دیا وہ جب بھی سندھ کابینہ میں وزیر بنتے ان کی کھلی کچہریاں عام اور مظلوم لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتیں ان کے دفتر میں کبھی پروٹوکول نہیں دیکھا ہر شخص ہر وقت ان سے مل سکتا تھا پھر وہ غریبوں کے مسائل حل کرنے میں نہ صرف دلچسپی لیتے تھے بلکہ اپنی جیب سے بھی ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے جس سے ان کی شہرت اور عزت میں اضافہ ہوا اور وہ صوبہ کی مقبول ترین شخصیات کی صف اول میں آگئے یہی وجہ تھی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد بننے والی حکومت میں وہ سندھ کی وزارت اعلیٰ کے لیے زرداری صاحب کے پسندیدہ امیدوار بن گئے تھے یہ بھی بڑا دلچسپ قصہ ہے چہ جائیکہ آصف زرداری پارٹی کی بظاہر کمان سنبھال چکے تھے مگر پارٹی کی سینئر قیادت انہیں قبول کرنے کو ذہنی طور پر

تیار نہ تھی اور اندرون خانہ سنجیدہ چپقلش موجود تھی پھر بی بی کے سوئم میں دکھائے گئے جانشینی کے خط کی ایک جھلک پر بھی مخدوم امین فہیم اور خورشید شاہ جیسے سینیر رہنما بھی اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے انہوں نے سوئم کے جذباتی ماحول میں اعتراض تو نہ کیا مگر ان کے چہرہ کے تاثرات اور بعد کے رویہ نے زرداری صاحب کو پریشان کردیا، جبکہ ان ہی سینیرز کو بی بی کی قربت کی وجہ سے معلوم تھا کہ محترمہ بے نظیر پرویز مشرف کے دور میں ملک بدری کے دوران اور وطن واپسی پر بھی ماضی کے تجربات کے باعث آصف زرداری کی پارٹی یا سیاست میں مداخلت کے خلاف تھیں اور اس مسلہ پر میاں بیوی کے تعلقات میں بی بی کی شہادت تک سرد مہری بھی پائی جاتی رہی

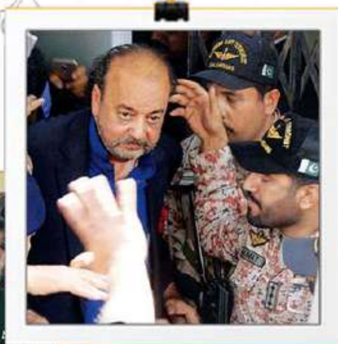

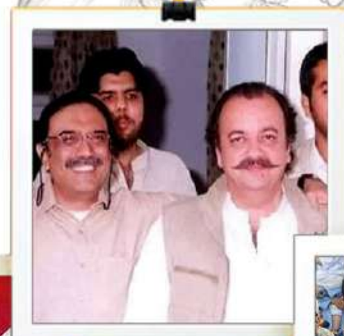

جس کی وجہ سے آصف زرداری پارٹی کی کمان سنبھالنے کے باوجود اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہے تھے اور بعض سیاسی مبصرین کے بقول یہی وجہ تھی کہ ملکی طاقت ور اسٹبلشمنٹ کی ہمدردیاں سمیٹنے اور طاقت کے ایک بڑے مرکز کو اپنے ساتھ ملانے کو ذہین ترین آصف نے ترپ کا شاندار پتہ کھیلتے ہوئے سوئم کے سوگ اور پاکستان مخالف غصہ سے بھرے جذباتی اجتماع میں بھی" پاکستان کھپے" کا نعرہ لگایا جو بعد میں ان کے بہت کام آیا، سینیر پارٹی قیادت جانتی ہے کہ سوئم کے فورن بعد آصف علی زرداری سکھر پہنچے اور انہوں نے سکھر ہاؤس میں اسلام الدین شیخ کے ہاں دو روز قیام کر کے سید خورشید شاہ کو رام کیا اس کارنامے کا زیادہ سہرا اسلام الدین شیخ کو جاتا ہے جس کا ثمر پہلے وہ اور اب ان کے بیٹے سمیٹ رہے ہیں یہ معرکہ سر کرنے کے بعد زرداری صاحب نے مخدوم امین فہیم پر کام شروع کیا مگر وہ زرداری کی کمزوری سے کھیلتے ہوئے وزارت عظمی سے کم پر بات کرنے کو تیار نہ تھے اور آصف انہیں نظر انداز یوں نہ کر سکتے تھے کہ ان کے ساتھ سندھ کے ارکان اسمبلی اور پارٹی کی اہم قیادت یک زبان تھی یہی وجہ تھی کہ بقول مخدوم جاوید ہاشمی کے نواز شریف کی قیادت میں محترمہ بے نظیر کی تعزیت کے لیے نوڈیرو لاڑکانہ جانے والے ن لیگ کے تین رکنی وفد سے زرداری صاحب نے درخواست کی کہ وہ مخدوم امین سے ان کی جان چھڑائیں بقول جاوید ہاشمی کے وہاں تعزیت کا سوگوار ماحول تھا ہی نہیں بلکہ اقتدار کی بندر بانٹ کے لیے توڑ جوڑ زوروں پر تھا، بعد ازاں انتخابات کے بعد ہی زرداری صاحب کی فرمائش پر خواجہ آصف نے اسلام آباد پہنچ کر یہ بیان داغ دیا کہ اگر پی پی پی نے مخدوم امین فہیم کو وزارت عظمی کے لیے نام زد کیا تو ن لیگ ان کی حمایت نہیں کرے گی یوں زرداری صاحب نے ترپ کا ایک پتہ اور کھیل کر وزارت عظمی کے سب سے مضبوط امیدوار کو متنازعہ کر کے مخدوم امین کو پارٹی میں بے اثر کردیا، ملکی سیاست کا انتہائی نفیس اور شریف النفس سیاستداں سب سے بڑی کرسی کی بازی ہار گیا اور باقی زندگی آصف زرداری کی ناراض گی کا نشانہ بنتے ہوئے گزار کر اس دنیا سے کوچ کر گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) اس خطرے سے نپٹ کر زرداری صاحب نئی حکومت کی تشکیل کے لیے اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے پارٹی کی اہم اور طاقت ور مشاورتی کمیٹی (سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی) کا اجلاس بلا لیا اب یہ نہیں معلوم کہ اجلاس کے دوران یا اس سے ہٹ کر انہوں نے آغا سراج درانی جو مشکل کی اس گھڑی میں مسلسل سائے کی طرح ان کے ساتھ تھے کو کہا کہ وہ تیاری کریں اگلے وزیر اعلی سندھ وہ ہوں گے کوئی شب کے 11 یا 12 بجے ہوں گے کہ مجھے آغا جاوید کا فون آیا کہ میں آغا سراج درانی کا پیغام لے کر آرہا ہوں آپ دفتر میں رکیں آغا جاوید (مرحوم) وہ جذباتی جیالا تھا جس نے محترمہ بے نظیر کی شہادت کے بعد ان پر تبرا کرنے والے اس وقت کے وزیر اعلی ارباب غلام رحیم کو سندھ اسمبلی کی گیلری میں جوتا مارا تھا جس پر وہ جیل بھی گیا اور پولیس تشدد کا نشانہ بھی اور پارٹی میں اسے ہیرو کا درجہ ملا وہ آغا سراج درانی کی برادری سے اور ان کا قابل اعتماد کارکن تھا اس نے آتے ہی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا کہ زرداری صاحب نے آغا سراج کو سندھ کی وزارت اعلی کے لیے نامزد کر دیا ہے اس کی خبر چلانی ہے میںنے اس کی مخالفت کرتے ہوئے آغا سراج سے جاوید کے نمبر سے ہی بات کی اور انہیں اس کے نقصان دہ مضمرات سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس مرحلے پر خبر کی اشاعت نقصان دہ ہوگی سندھ میں طاقت ور سید لابی کے علاوہ سید قائم علی شاہ موجود تھے جو محترمہ بے نظیر کا بھی انتخاب رہے تھے پھر وہ حالیہ الیکشن میں پیر پاگارا کو ہرا کر بھاری اکثریت سے انتخاب جیتے تھے اس کے علاوہ بھی کچھ دیگر خطرات میں محسوس کر رہا تھا مگر آغا سراج خبر شائع کرنے پر بضد تھے وہ بہت پر جوش اور جذباتی ہو رہے تھے میںنے ان کے اصرار پر خبر شائع کردی جو روزنامہ آج کل میں صفحہ اول پر سنگل چھپی میں ان دنوں اس اخبار کا کراچی میں چیف رپورٹر تھا یہ اخبار نجم سیٹھی اور سلیمان تاثیر نے مل کر نکالا تھا یہ منفرد اسلوب اور خبروں کی ترسیل کے نئے انداز کی وجہ سے روز بروز مقبول ہو رہا تھا دوسرے روز یہی خبر کئی چینلز میں نشر اور اخبارات میں چھپی جس پر سیاسی حلقوں میں عموما اور پی پی میں خصوصا ہلچل مچ گئی وزارت اعلی کے تین چار دیگر اُمیدواروں نے توڑ جوڑ شروع کر دیا،

..............................(بقیہ: اگلی قسط میں)

برنس روڈ مافیا کے قبضے میں آگیا

عدالتی حکم کے باوجود کمشنر کراچی نے برنس روڈ کا رخ تک نہ کیا

کراچی کا برنس روڈ، جو لذت و ذائقے کی پہچان کے طور پر نہ صرف شہر بلکہ ملک بھر میں شہرت رکھتا ہے، آج بدنظمی اور بے ہنگم تجاوزات کی ایک بڑی مثال بن چکا ہے۔ یہاں کا ماحول اب صرف کھانے کے شوقین افراد کے لیے نہیں رہا بلکہ مقامی آبادی کے لیے مسلسل اذیت کا سبب بن رہا ہے۔

آپریشن تو ہر جگہ......مگر برنس روڈ پر خاموشی

حکومتی سطح پر فٹ پاتھوں اور عوامی مقامات سے قبضہ مافیا کے خاتمے کے لیے شہر بھر میں کارروائیاں جاری ہیں۔ کمشنر کراچی کی ہدایت پر مختلف علاقوں میں ہوٹلوں اور دیگر دکانوں کے باہر قائم تجاوزات ہٹائی جا رہی ہیں۔

تاہم حیرت انگیز طور پر برنس روڈ اس عمل سے باہر ہے بی حالانکہ یہاں واضح عدالتی حکم موجود ہے۔ مقامی مکینوں کے مطابق "پورے شہر میں ہتھوڑے چل رہے ہیں، مگر برنس روڈ پر عدالتی حکم کے باوجود ایک ہتھوڑا ابھی نہیں چلا''۔

عدالتی فیصلے پر عملدرآمد اب تک خواب

کئی ماہ قبل سندھ ہائیکورٹ نے مکینوں کی درخواست پر علاقے سے ہوٹل مافیا کا قبضہ ختم کرانے، اور انہیں اپنی حدود تک محدود رکھنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن تا حال اس فیصلے پر عملدرآمد نہیں ہوسکا۔

اس تاخیر نے لوگوں میں مایوسی اور بے چینی پیدا کر دی ہے۔ مکینوں کا موقف ہے کہ مقامی انتظامیہ اور پولیس کی خاموشی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہوٹل مافیا کو کسی نہ کسی سطح پر سرپرستی حاصل ہے۔

فٹ پاتھوں پر قبضہ، خواتین کا نکلنا مشکل

برنس روڈ کے رہائشی عبداللہ گدی نے میڈیا سے گفتگو میں بتایا کہ ہوٹلز کے باہر رکھے گئے ٹیبل اور کرسیاں پورے راستے کو بند کر دیتی ہیں۔

ان کے مطابق: "رات کے وقت خواتین کا گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ فٹ پاتھ عوام کے لیے نہیں بلکہ ہوٹلوں کے لیے مخصوص ہو چکے ہیں۔''

بارہا جھگڑے اور تلخ کلامیاں ہو چکی ہیں، لیکن پولیس اور انتظامیہ اب تک خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔

ٹاؤن انتظامیہ پر ملی بھگت کا الزام

مقامی آبادی کا کہنا ہے کہ ٹاؤن انتظامیہ کی پشت پناہی کے بغیر یہ قبضہ ممکن نہیں۔ انتظامیہ اگر چاہے تو چند گھنٹوں میں تجاوزات کا خاتمہ کر سکتی ہے، مگر غیر واضح وجوہات کی بنا پر کارروائی سے گریز دیکھا جا رہا ہے۔

احتجاج کی تیاری

عبداللہ گدی اور دیگر مکینوں نے خبردار کیا ہے کہ اگر جلد کارروائی نہ کی گئی تو وہ دھرنے سمیت بھرپور احتجاجی مہم شروع کریں گے۔

"ہم صبر کر رہے ہیں، مگر اگر معاملات نہ بدلے تو ہم سڑکوں پر نکلیں گے اور ہوٹل مافیا کو سبق سکھائیں گے۔''

کب بدلے گا منظر؟

برنس روڈ کا مسئلہ تجاوزات کے عام ایشو سے کہیں آگے نکل چکا ہے۔

یہ اب انتظامی کارکردگی، عدالتی احکامات کی عملداری اور شہری حقوق کے تحفظ کا امتحان بن چکا ہے۔

یہ علاقہ جہاں کبھی بوڑھے، خواتین اور بچے بے خوف گھوما کرتے تھے، آج کاروباری قبضہ گروپوں کے آگے بے بس دکھائی دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ شہر کے دل میں موجود یہ بے ضابطگی کب ختم ہوگی؟

شہری کیا واقعی احتجاج پر مجبور ہوں گے؟

یا عدالتی احکامات کا وقار بحال ہوگا؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات اب بھی منتظر ہیں۔

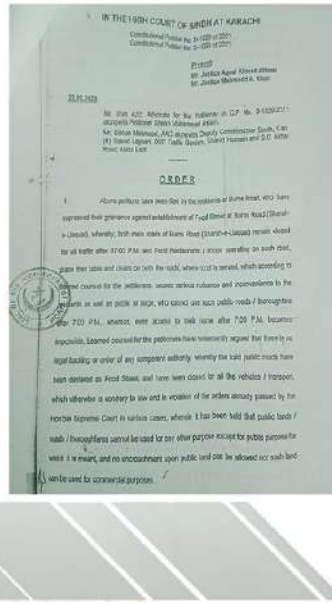
IN THE HIGH COURT OF SINDH AT KARACHI

ORDER

دنیا بھر میں امریکہ کے کتنے فوجی اڈے ہیں؟

یہ تعداد اتنی زیادہ ہے اور فرق اتنا وسیع ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ امریکی وزارت دفاع کے پاس بھی دنیا بھر میں پھیلے اپنے اڈوں کی صحیح تعداد نہیں ہے

امریکہ کا محکمہ دفاع سب سے پرانا اور سب سے بڑا محکمہ ہے، جس کا سالانہ بجٹ پورے ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ 2025 میں یہ 849 ارب ڈالر سے زیادہ تھا (گرافک: انڈیپنڈنٹ عربیہ)

دنیا بھر میں امریکہ کے کتنے فوجی اڈے ہیں؟ اس سوال کا جواب آپ کے خیال سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔

اگر آپ درست جواب کے لیے امریکی محکمہ دفاع کی ویب سائٹس اور ریکارڈ تلاش کرتے ہیں، تو آپ کو یہ نہیں ملے گا۔ یہاں آپ کو 120 سے لے کر تقریباً 800 اڈوں تک کے جوابات ملیں گے۔

تعداد اتنی زیادہ ہے اور فرق اتنا وسیع ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ امریکی وزارت دفاع کے پاس بھی دنیا بھر میں پھیلے اپنے اڈوں کی صحیح تعداد نہیں ہے۔

تو ہم بیرون ملک امریکی افواج کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ ان کے اہم ترین فوجی اڈے کہاں واقع ہیں؟ اور واشنگٹن ان سے کیا چاہتا ہے؟

امریکہ کا محکمہ دفاع سب سے پرانا اور سب سے بڑا محکمہ ہے، جس کا سالانہ بجٹ دنیا کے تمام ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ 2025 میں یہ 849 ارب ڈالر سے زیادہ تھا۔

محکمہ دفاع کی 2023 کی مالیاتی رپورٹ کے مطابق یہ محکمہ دنیا بھر میں 000,667 سے زیادہ اثاثوں کا انتظام چلاتا ہے جن میں عمارتیں، ڈھانچے اور سہولیات جیسے کہ سڑکیں اور باڑ شامل ہیں۔ یہ سب کچھ امریکہ کو دنیا کی اقوام اور فوجوں میں سب سے آگے رکھتا ہے۔

امریکی افواج: وہ کون ہیں اور کہاں ہیں؟

امریکی فوج میں 000,324 نیشنل گارڈ کے اہلکاروں، 000,437 سے زیادہ ریزرو اہلکار، اور محکمہ دفاع کے ساتھ 000,727 سے زیادہ سویلین کنٹریکٹرز کے علاوہ، ملک کے اندر اور باہر تعینات 13 لاکھ سے زیادہ فعال ڈیوٹی فوجی اہلکار شامل ہیں۔

دسمبر 2024 میں شائع ہونے والے تازہ ترین سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، جو صرف غیر مرتب شدہ اعداد و شمار پیش کرتے ہیں، 974,128,1 فوجی اہلکار 50 امریکی ریاستوں اور واشنگٹن ڈی سی میں خدمات انجام دے رہے ہیں، جب کہ 000,172 فعال ڈیوٹی والے فوجی بیرون ملک تعینات ہیں۔

اس کے علاوہ 541,30 نیشنل گارڈ اور ریزرو اہلکار اور 962,34 شہری ٹھیکیدار محکمہ دفاع کے ساتھ، امریکہ سے باہر اڈوں اور مشنوں پر تعینات ہیں۔

وہ ممالک جو سب سے زیادہ امریکی فوجیوں کی میزبانی کرتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ میں امریکی افواج

یو ایس ڈپارٹمنٹ آف ڈیفنس ڈیٹا سینٹر کی رپورٹ 31 دسمبر 2024 تک، بشمول ایکٹیو ڈیوٹی سپاہی، سویلین کنٹریکٹرز کو چھوڑ کر۔

بحرین 3440۔ ترکی 1696۔ کویت 523۔ سعودی عرب 277
قطر 223۔ مصر 166۔ اسرائیل 104

امریکی افواج کے مقامات اور بیرون ملک ان کے اہم ترین اڈوں کے بارے میں مزید جاننے سے پہلے امریکی فوجی توسیع کے آغاز کا پس پردہ جاننا ضروری ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کئی دہائیوں تک، امریکہ نے عالمی بحرانوں میں غیر جانبداری برقرار رکھی اور غیر ملکی تنازعات میں فوجی مداخلت سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ اس کے رہنماؤں نے مختلف وجوہات کی بنا پر لیگ آف نیشنز میں شامل ہونے سے انکار کر دیا، جو پہلی جنگ عظیم کے بعد تشکیل دی گئی تھی۔

تاہم، چند سالوں میں زمینی حقائق مکمل طور پر بدل گئے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے اور تنازعات میں اضافے کے ساتھ، امریکہ ایک غیر فعال طاقت سے دنیا کے سب سے طاقتور ملک میں تبدیل ہو گیا، جس کے فوجی بیڑے پوری دنیا میں تھے۔ تو یہ امریکی توسیع کیسے شروع ہوئی؟

چرچل کا پہلا خط

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ کے پاس دنیا کی سب سے طاقتور بحریہ موجود تھی۔ تاہم، جرمنوں کی پیش قدمی نے اتحادیوں، خاص طور پر جرمن آبدوزوں نے انہیں ایک بڑا خطرہ لاحق کر دیا، جنہیں 'یو بوٹس' کہا جاتا ہے، جو برلن دشمن ممالک، خاص طور پر برطانیہ کو خوراک، سامان اور رسد لے جانے والے تجارتی بحری جہازوں کو نشانہ بنانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اس نے لندن کو خطرے سے دوچار کر دیا، جو اپنی بحری برتری کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے اپنے 179 میں سے 11 کو کھونے کے بعد ڈسٹرائرز کی اشد ضرورت تھی۔ ان کی تعمیر میں کم از کم ایک سال کا عرصہ لگ سکتا تھا۔

سنگین صورت حال کے پیش نظر برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے امریکی صدر فرینکلن روزویلٹ کو ایک خط بھیجا، جس میں کہا گیا کہ وہ ان کو امریکی بیڑے میں 40 یا 50 ڈسٹرائرز فراہم کرے، اس شرط پر کہ اس قیمت کو قرض سمجھا جائے، کیونکہ اس وقت لندن اس کی ادائیگی کے قابل نہیں تھا۔

فرینکلن نے فوری طور پر اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے متعدد وجوہات کی بنا پر جن میں امریکہ کی غیر جانبداری کے عزم اور دیگر لوگوں کی جنگوں میں مداخلت کے خلاف رائے عامہ کو مشتعل کرنے کے خوف، خاص طور پر ملک کا اس وقت صدارتی انتخابات کے دہانے پر ہونے کی وجہ سے برطانوی درخواست کو مسترد کر دیا۔ جنگ کے بڑھنے کی صورت میں امریکہ کو اپنے آپ کو ممکنہ جرمن حملے سے بچانے کی ضرورت بھی تھی۔ امریکی صدر کا خیال تھا کہ اگر برطانیہ نازیوں کے حملے کو روکنے میں ناکام رہا اور اگر برلن نے لندن کی حمایت کا بدلہ امریکیوں سے لیا تو امریکہ کا کیا بنے گا؟

تاریخی معاہدہ

31 جولائی کو چرچل نے روزویلٹ کو لکھے گئے ایک نئے خط میں امریکیوں سے بحری جہازوں کے حصول کی اپنی کوششوں کی تجدید کی، جس میں کہا گیا، 'جناب صدر، تمام احترام کے ساتھ، دنیا کی طویل تاریخ کے پیش نظر، یہ وہ کام ہے جو اب ہونا چاہیے۔' یہ خط امریکی پوزیشن میں تبدیلی کا سبب بنا۔ فرانس کے زوال کے بعد، روزویلٹ انتظامیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ جرمنی کو شکست دینے کے لیے برطانیہ کو ڈسٹرائر سپلائی کرنا بہتر ہے، ورنہ ہٹلر اپنی فوجوں کا رخ امریکہ کی جانب کر دے گا۔ اس یقین کی بنیاد پر، واشنگٹن نے ایک باہمی فائدہ مند معاہدے کی تلاش شروع کر دی جس کے تحت امریکہ بحر اوقیانوس اور کیریبین میں اڈے حاصل کرے گا تاکہ اس کی سلامتی کو بہتر بنایا جا سکے، اس کے بدلے میں برطانیہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے کے پرانے امریکی ڈسٹرائر حاصل کرے گا، جو کہ برطانیہ کے لیے ایک بہت اہم فوجی اضافے کی نمائندگی کرتا تھا۔

درحقیقت، چرچل روزویلٹ کے ساتھ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ برطانیہ کو گولہ بارود، خوراک اور دیگر سامان سے لدے امریکی سامان ملا، جبکہ امریکہ کو نیو فاؤنڈ لینڈ، برمودا، بہاماس، جمیکا، سینٹ لوشیا، ٹرینیڈاڈ، اینٹیگوا اور برطانوی گوانا کی آٹھ برطانوی کالونیوں میں اڈے ملے۔ اس معاہدے نے امریکہ کو ان کالونیوں پر 99 سال کی مدت کے لیے کنٹرول دیا تھا۔

ان اڈوں نے قلعہ بندی کے طور پر کام کیا جس نے امریکہ کو اپنے علاقے کو بشمول برطانوی کالونیوں، نہر پاناما اور شمالی اور جنوبی امریکہ کسی بھی نازی حملے سے بچانے میں مدد کی۔ اگرچہ یہ معاہدہ، جسے 'ڈسٹرائرز فار بیسز ڈیل' کے نام سے جانا جاتا ہے، امریکہ کے باضابطہ طور پر دوسری جنگ عظیم میں داخل ہونے سے تقریباً ایک سال قبل ہوا، لیکن اس نے امریکہ کی اپنی

غیر جانبداری کو بتدریج ترک کرنے کا آغاز کیا اور پوری دنیا میں امریکی فوجی توسیع کے دور کا آغاز کیا۔

عالمی رسائی

حالیہ برسوں کے دوران، ضرورت، حالات اور مفادات کے مطابق بیرون ملک تعینات امریکی افواج کے مقامات اور حدود میں تبدیلی آئی ہے۔ مثال کے طور پر، سرد جنگ کے دوران، سوویت یونین کی توسیع کا مقابلہ کرنے کے لیے یورپ میں تقریباً 400,000 امریکی فوجی موجود تھے۔ 1991 میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد براعظم میں امریکی افواج کی تعداد میں کمی آنا شروع ہوگئی۔

جولائی 2024 کی کانگریشنل ریسرچ سروس کی رپورٹ کے مطابق 'بیرون ملک امریکی فوجی اڈے: کانگریس کے لیے پس منظر اور مسائل'، امریکی محکمہ دفاع کم از کم 51 ممالک میں کم از کم 128 فوجی اڈے چلاتا یا استعمال کرتا ہے۔

امریکی عالمی رہنما

امریکی محکمہ دفاع دنیا بھر میں اپنی افواج کا انتظام کرتا ہے اور اپنے مشن کو 11 متحد کمانڈز پر مشتمل ڈھانچے کے ذریعے چلاتا ہے، جس میں سائبر کمانڈ، سپیس کمانڈ، سپیشل آپریشنز کمانڈ، سٹریٹجک کمانڈ اور ٹرانسپورٹ کمانڈ شامل ہیں۔

شمالی کمان

یہ مشن امریکہ کے اندر اور شمالی امریکہ کے علاقے میں سکیورٹی کے خطرات سے نمٹنے کے لیے محکمہ دفاع کی کوششوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ کمانڈ ملک بھر میں اڈوں پر تعینات امریکی افواج کی سب سے بڑی تعداد کی نگرانی کرتا ہے۔

سدرن کمانڈ

یہ جنوبی امریکہ کی نگرانی کرتا ہے، بہاماس کو چھوڑ کر، جو شمالی کمان کا حصہ ہے۔

اس خطے میں تین مستقل اور تین دیگر فوجی اڈے شامل ہیں جہاں تک امریکی افواج کی رسائی ہے۔ مجموعی طور پر تقریباً 1,650 فعال ڈیوٹی والے فوجی اہلکار (مارچ 2024 تک) تعینات ہیں۔

منشیات کی سمگلنگ، بین الاقوامی مجرمانہ تنظیموں کا مقابلہ کرنا اور روسی اور چینی اثر و رسوخ کو روکنا خطے میں امریکہ کے سب سے نمایاں مفادات ہیں۔

یورپی کمانڈ

یہ روس سمیت یورپی براعظم کی نگرانی کرتا ہے۔

اس خطے میں 31 مستقل امریکی فوجی اڈے اور 19 دیگر شامل ہیں جن تک امریکی افواج کی رسائی ہے۔ مجموعی طور پر تقریباً 67,000 فعال ڈیوٹی فوجی وہاں تعینات ہیں (مارچ 2024 تک)، ایک تعداد جو بعد میں بڑھ کر تقریباً 80,000 ہوگئی ہے۔

انسرلک ایئر بیس، ترکی

ترکی کے صوبہ اڈانا میں ایک سٹریٹجک ایئر بیس، جو بنیادی طور پر ترکی اور امریکی فضائی افواج کے ساتھ ساتھ نیٹو اور اتحادی ممالک کی افواج کے ذریعے استعمال ہوتی ہے۔

تقریباً 13.35 مربع کلومیٹر کے رقبے پر محیط یہ بحیرہ روم کے ساحل سے تقریباً 32 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ امریکی فضائیہ کے 39 ویں فائٹر سکواڈرن کا ہیڈکوارٹر ہے اور اس میں دو رن وے اور ہینگرز شامل ہیں جن میں 57 لڑاکا طیاروں کو ایڈجسٹ کیا جا سکتا ہے۔

فوجی سہولیات کے علاوہ، اڈے میں اپنے اہلکاروں اور ان کے خاندانوں کے لیے ایک مربوط شہر بھی شامل ہے۔

یہ اڈہ، جس کی تعمیر 1951 میں واشنگٹن کی نگرانی میں شروع ہوئی تھی اور اسے ترکوں اور امریکیوں کی طرف سے مشترکہ طور پر استعمال کیا جانا تھا۔ اس نے گذشتہ برسوں میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، جو امریکی فوج کے لیے ایک علاقائی ذخیرہ کرنے کے مرکز اور دنیا بھر میں مشرق وسطی کے قلب میں اس کے مقام اور روس اور ایشیا سے اس کی قربت کے پیش نظر متعدد فوجی مہمات کے لیے ایک نقطہ آغاز کے طور پر کام کر رہا ہے۔

سرد جنگ کے دوران، امریکی افواج نے سوویت یونین پر قابو پانے اور علاقائی بحرانوں کا جواب دینے کے لیے انسرلک کو ایک اڈے کے طور پر استعمال کیا۔ امریکی جاسوس طیارے وہاں سے سوویت سیٹلائٹ ریاستوں کے اوپر پرواز کرنے کے لیے اڑتے تھے، اور ڈیٹرنٹ پالیسی کے تحت تقریباً 150 جوہری وار ہیڈز وہاں محفوظ کیے گئے تھے۔

اسی انسرلک اڈے سے، طیارے نے 1958 میں امریکی افواج کو لبنان پہنچایا۔ وہاں سے، بین الاقوامی اتحادی جنگجوؤں نے عراقی افواج کے خلاف حملے شروع کیے جنہوں نے 1991 میں کویت پر حملہ کیا تھا۔ وہاں سے، امریکی طیاروں نے 11 ستمبر 2001 کے حملوں کے بعد افغانستان میں القاعدہ اور طالبان کے ٹھکانوں پر بمباری کی اور شام میں داعش کے ٹھکانوں پر بمباری کی۔

مزید برآں، امریکی افواج اس اڈے کو خصوصی مشن، ایندھن بھرنے، اور خطے میں تعینات فورسز کی معاونت کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اطلاعات کے مطابق اس وقت تقریباً 50 جوہری وار ہیڈز وہاں محفوظ ہیں۔

العدید ایئر بیس، قطر

خلیجی خطے میں امریکی فوجی اڈوں میں سے ایک اور مشرق وسطی میں سب سے بڑا امریکی فوجی اڈہ، العدید ایئر بیس میں امریکی فضائیہ کی سینٹرل کمانڈ، کمبائنڈ ایئر اینڈ سپیس آپریشنز سینٹر، 379 ویں فضائی مہم کا ونگ اور 319 واں فضائی مہم کا گروپ واقع ہے۔

2000 میں امریکہ نے اسے اپنے اختیار میں رکھا۔ آج، یہ خلیج کے علاقے میں پانچ کلومیٹر طویل ترین فضائی پٹی کا حامل ہے۔ 120 سے زیادہ طیارے، بشمول بمبار، جنگجو اور جاسوس طیارے وہاں تعینات ہیں، جیسا کہ ٹینک، فوجی امدادی یونٹ اور جدید فوجی ساز و سامان اور مشینری۔

اس میں ہتھیاروں اور ایندھن کے ڈپو کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں اور ہوائی جہاز کی دیکھ بھال کی ورکشاپس بھی ہیں۔

اس سب کی وجہ سے کچھ فوجی اہلکاروں کو اسے خطے میں سب سے بڑے سٹریٹجک امریکی ہتھیاروں کے ڈپو کے طور پر درجہ بندی کرنے پر مجبور کیا ہے۔

افغانستان میں امریکی فوجی آپریشن کے آغاز پر، F-16 لڑاکا طیاروں اور نگرانی کے طیاروں نے العدید ایئر بیس کو ہیڈکوارٹر اور ایندھن بھرنے کے مرکزی سٹیشن کے طور پر استعمال کیا۔

2016 میں، اس بیس سے B-52 بمبار طیاروں نے عراق اور شام میں داعش کے ٹھکانوں پر حملہ کیا۔

اطلاعات کے مطابق، اس اڈے میں اس وقت تقریباً 11,000 امریکی مقیم ہیں، جن میں فوجی اہلکار، عام شہری اور ان کے اہل خانہ شامل ہیں۔

کڈینا بیس، جاپان

یہ پیسیفک ایئر پاور کا مرکز ہے اور امریکی فضائیہ کے 18 ویں جنگی ونگ کا ہیڈکوارٹر ہے، یہ سب سے پیچیدہ آپریشنل جنگی ونگوں میں سے ایک ہے اور اسے دیئے گئے طیاروں کی تعداد کے لحاظ سے امریکہ سے باہر سب سے بڑا ہے۔

اس اڈے کو اس کے سٹریٹجک جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے 'بحرالکاہل کا سنگ بنیاد' سمجھا جاتا ہے، جو شنگھائی، چین سے صرف 750 کلومیٹر کے فاصلے پر اور تائیوان، شمالی اور جنوبی کوریا اور بحیرہ جنوبی چین کے قریب ہے۔

بیس پر قائم فورسز ہائی ٹیک ٹیکنالوجیز بشمول ڈرونز کا استعمال کرتے ہوئے جاسوسی اور نگرانی کی کارروائیاں کرتی ہیں۔

بیس میں تقریباً 18,000 امریکی فوجی، سویلین کنٹریکٹرز اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ ساتھ 4000 سے زائد جاپانی ملازمین اور ٹھیکیدار موجود ہیں۔ اوکیناوا کی معیشت پر بیس کے اقتصادی اثرات کا تخمینہ سالانہ 700 ملین ڈالر سے زیادہ ہے۔

اینڈرسن ایئر فورس بیس، گوام، یو ایس

یہ اڈہ ایک امریکی جزیرے پر واقع ہے لیکن یہ دنیا کے اہم ترین امریکی فوجی اڈوں میں سے ایک ہے۔ مغربی بحرالکاہل میں یہ واحد واحد ہے جو مستقل طور پر سٹریٹجک بمباروں جیسے B-1، B-2 اور B-52 کی میزبانی کر سکتا ہے۔

یہ 1944 میں دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی دنوں میں شروع ہوا اور ویت نام جنگ کے دوران اس نے اہم کردار ادا کیا۔

آج بیس میں بڑے پیمانے پر ایندھن اور گولہ بارود ذخیرہ کرنے کی سہولیات اور طویل رن وے ہیں، اور یہ جنوب مغربی بحرالکاہل اور بحر ہند کے علاقوں میں تربیت اور ہنگامی کارروائیوں کے لیے ایک اہم لاجسٹک سپورٹ سینٹر ہے۔

مسلسل تیاری میں ایک فوج، کم از کم 120 اڈے یا اس سے زیادہ، دسیوں ہزار فوجی اور مشرق سے مغرب تک فوجی تعیناتی اور دنیا کے کونے کونے میں مخالفین کو نشانہ بنانے کی صلاحیت۔۔۔ امریکی فوجی تعیناتی صرف موجودگی نہیں ہے۔۔۔ بلکہ کسی بھی لمحے جواب دینے کے لیے مستقل تیاری ہے۔

مختلف ممالک اپنے ذخائر میں ہزاروں ٹن سونا کیوں رکھتے ہیں اور کیا اس قیمتی دھات کی قیمت میں حالیہ اضافے کی وجہ چین ہے؟

دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی سونے کی قیمت گذشتہ کئی ماہ سے تاریخی بلندیوں کو چھوتی رہی ہے، جہاں انٹرنیشنل مارکیٹ میں فی اونس سونے کی قیمت 4300 ڈالر تک پہنچ گئی تھی وہیں پاکستان میں بھی سونے کی فی تولہ قیمت ساڑھے چار لاکھ روپے پر پہنچنے کے بعد اب کچھ کم ہوئی ہے۔

پاکستان میں سونے کی قیمت کے تعین میں طلب اور رسد کے علاوہ روپے کے مقابلے میں ڈالر کی قدر اور بین الاقوامی مارکیٹ میں سونے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ گذشتہ کئی ماہ سے ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر مستحکم ہے لیکن بین الاقوامی مارکیٹ میں سونے کی قیمت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں سونے کی قیمت کیوں بڑھ رہی ہے؟

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ امریکہ میں اکتوبر کے مہینے کا آغاز شٹ ڈوان سے ہوا، صدر ٹرمپ اور فیڈرل ریزور بینک کے مابین شرح سود میں کمی پر اختلاف اور امریکی معیشت کے غیر تسلی بخش اعداد و شمار سے ڈالر کی قدر کم ہوئی اور ایسے میں سرمایہ کاروں نے سونا کو محفوظ سمجھتے ہوئے اُس میں سرمایہ کاری کی۔

معروف کریڈٹ ریٹنگ ایجنسی 'جے پی مورگن' کی رپورٹ کے مطابق جیو پولیٹکل خطرات، عالمی کساد بازاری اور ٹیرف اور ڈیوٹیز کے باعث عالمی تجارتی رکاوٹوں کے سبب سونے کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے جس سے قیمت بڑھ رہی ہے۔

اس سب کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک کے مرکزی بینکوں کی جانب سے بھی سونے کی خریداری میں تیزی کا رجحان دیکھا گیا۔

مختلف ممالک کے مرکزی بینک سونا کیوں خرید رہے ہیں؟

دنیا بھر میں ملکوں کے مرکزی بینکوں کے پاس جہاں ڈالر اور دوسری غیر ملکی کرنسیوں کی صورت میں زرمبادلہ کے ذخائر موجود ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ سونا بھی ان ذخائر کا حصہ ہوتا ہے۔

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو مرکزی بینکوں کے ذخائر سونے پر مشتمل ہوتے تھے اور ماضی میں کسی ملک کی کرنسی کا قدر کا انحصار بھی اُس ملک کے مرکزی بینک کے پاس موجود سونے کی ذخائر پر ہوتا تھا۔

صنعتی ترقی اور تجارتی لین دین کے لیے ڈالر کے استعمال کے بعد مرکزی بینک نے اپنے ذخائر دوسرے ممالک کی کرنسی اور بانڈ میں منتقل کیے، لیکن اس کے باوجود ہر ملک کے مرکزی بینک کے ذخائر کا کچھ حصہ آج بھی سونے پر مشتمل ہوتا ہے۔

جے پی مورگن کا کہنا ہے کہ کئی ممالک کے مرکزی بینک اپنے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کو غیر ملکی کرنسی یعنی ڈالر میں رکھنے کے بجائے انھیں سونے میں منتقل کر رہے ہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مختلف ممالک کے مرکزی بینک کی جانب سے سونے کی خریداری کے سبب عالمی مارکیٹ میں سونے کی قیمت بڑھ رہی ہے۔

سال 2024 تک دنیا بھر کے ممالک کے مرکزی بینکوں کے پاس سونے کے مجموعی ذخائر 36200 ٹن (تین کروڑ 62 لاکھ کلوگرام) تھے جو کہ مرکزی بینکوں کے پاس موجود اثاثوں کا 20 فیصد ہے، تاہم سنہ 2023 میں سونے کی شکل میں محفوظ اثاثوں کی شرح 15 فیصد تھی۔

سنہ 2024 میں چین، ترکی، انڈیا، عراق، آزربائیجان اُن ممالک میں شامل ہیں جنھوں نے ایک سال کے دوران 20 ٹن (20 ہزار کلو) سونا خریدا۔

اقتصادی ماہرین کا کہنا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ڈالر کا کمزور ہونا، امریکہ میں شرحِ سود میں کمی، معیشت اور عالمی سطح پر عدم استحکام: یہ وہ عوامل ہیں جن کے وجہ سے سرمایہ کار اور ممالک سونے کو محفوظ اثاثے کے طور پر دیکھ رہے ہیں کیونکہ کرنسی یا بانڈ جیسے دیگر اثاثوں کی طرح سونے کی قدر کسی ایک فیصلے کے بعد بہت تیزی سے نیچے نہیں گرتی ہے۔

جے پی مورگن کا کہنا ہے کہ امریکہ کی غیر مستحکم تجارتی پالیساں اور غیر متوقع جیو پولیٹیکل الائنس کو دیکھتے ہوئے یہ امکان ہے کہ سال 2025 میں بھی مرکزی بینک مزید سونا اپنے ذخائر میں منتقل کریں گے اور ممکنہ طور پر 900 ٹن مزید سونا خریدیں گے۔

کس ملک کے پاس کتنا سونا ہے؟

عمومی خیال ہے کہ جن ممالک کے پاس جتنے زیادہ سونے کے ذخائر ہوتے ہیں، اُس کی کرنسی اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے۔ دنیا کے کئی ممالک کے مرکزی بینک اپنے غیر ملکی اثاثوں کو سونے میں محفوظ کرتے ہیں۔

ورلڈ گولڈ کونسل کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ سونے کے ذخائر امریکہ کے پاس ہیں اور امریکہ کے پاس مجموعی طور پر 8133 ٹن (81 لاکھ کلوگرام سے زیادہ) سونے کے ذخائر موجود ہیں جو اُس کے مجموعی غیر ملکی اثاثوں کا 78 فیصد ہیں۔

آئی ایم ایف کے ڈیٹا کے مطابق سنہ 2024 تک دنیا کے مرکزی بینکوں کے پاس موجود 36200 ٹن سونے کے ذخائر میں سے 16400 ٹن سونا مجموعی طور پر امریکہ، جرمنی، فرانس اور اٹلی کے مرکزی بینکوں کے پاس ہے۔

امریکہ، جرمنی، فرانس اور اٹلی کے مرکزی بینک اپنے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کا 70 فصد سے زیادہ سونے پر مشتمل ہے۔

سونے خریدنے کی دوڑ میں چین اس وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور گذشتہ دو سال کے دوران چین کا مرکزی بینک اپنے ذخائر کو دیگر اثاثوں کے بجائے سونے کے ذخائر میں منتقل کر رہا ہے۔

ورلڈ گولڈ کونسل کے اعداد و شمار کے مطابق چین کے مرکزی بینک کے پاس سونے کے 2298 ٹن (22 لاکھ 98 ہزار کلوگرام) کے ذخائر ہیں جو اُس کے مجموعی غیر ملکی اثاثوں کا محض 7.6 فیصد ہیں۔

ورلڈ گولڈ کونسل کے اعداد و شمار کے مطابق سال 2024 کے اختتام پر چین کے پاس 2279 ٹن سونے کے ذخائر موجود تھے۔ سنہ 2025 کے پہلے چھ ماہ کے دوران چین نے تقریباً 19 ٹن سونا مزید خریدا ہے جبکہ اس عرصے کے دوران امریکہ نے سونا نہیں خریدا۔

سنہ 2023 کے دوران بھی چین نے تقریباً 88 ٹن سونا خریدا تھا۔

چین کے علاوہ پولینڈ اور ترکیہ کے مرکزی بینک بھی سونا خرید رہے ہیں۔

پاکستان کا مرکزی بینک غیر ملکی زرمبادلہ کے اثاثوں میں مختلف ممالک کی کرنسیوں کے ساتھ ساتھ سونا بھی رکھتا ہے۔ سٹیٹ بینک آف پاکستان کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے پاس 4.6 ٹن (6400 کلوگرام) سونا موجود ہے جس کی مالیت سات ارب ڈالر ہے۔

پاکستان کے پڑوسی ملک انڈیا کے مرکزی بینک کے پاس 880 ٹن (آٹھ لاکھ، 80 ہزار کلوگرام) سونے کے ذخائر موجود ہیں۔ ورلڈ گولڈ کونسل کے مطابق انڈیا کے پاس 93

ارب ڈالر مالیت کا سونا ہے اور انڈیا کے غیر ملکی زر مبادلہ کے ذخائر کا 13 فیصد سونے پر مشتمل ہے۔

امریکہ اور چین کی لڑائی کیا سونے کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ بنی؟

رواں ماہ کے دوران بین الاقوامی مارکیٹ میں سونے کی قیمت اب تک کی بلند ترین سطح پر پہنچنے کے بعد کچھ کم ہوئی ہے۔

اقتصادی ماہرین کے خیال میں اکتوبر میں سونے کی قیمت کا بلند ترین سطح پر پہنچنے کے بعد قیمتوں میں کمی کا سبب بھی جیو پولیٹکل عوامل ہی ہیں۔

کموڈٹیز کے ماہر شمس السلام کا کہنا ہے کہ امریکہ اور چین کی تجارتی لڑائی سونے کی قیمت میں اضافے کی ایک وجہ بنی۔

انھوں نے کہا کہ امریکہ کی جانب سے ٹیرف پالیسی کے اعلان کے بعد چین نے پہلے تو سونا خریدا اور پھر جب قیمت 4380 ڈالر فی اونس کی تاریخی سطح پر پہنچی تو سونے کو بیچ کر منافع کمایا۔

اقتصادی تجزیہ کار احسن محنتی کا کہنا ہے کہ امریکہ میں یکم اکتوبر کو شروع ہونے والے مالی سال کا بجٹ منظور نہیں ہوا اور امریکی حکومت غیر فعال ہے جس سے سرمایہ کاروں نے امریکی مارکیٹ سے نکل سونے میں سرمایہ کاری کا رُخ کیا جس سے سونے کی قیمت میں اضافے ہوا۔

بی بی سی سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ امریکی صدر ٹرمپ ان دونوں ایشیا کے دورے پر ہیں۔ 'سرمایہ کار امریکی صدر کے ایشیا کے دورے کو بہت قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ صدر ٹرمپ کی چین کے صدر سے ملاقات کا امکان ہے اور اُمید ہے کہ تجارتی معاملات پر جو اختلافات ہے اُن میں کچھ کمی آ سکے۔ اس لیے وقتی طور پر سونے کی قیمتوں میں کچھ کمی آئی ہے۔'

شمس السلام کے مطابق چین اور اتحادی برکس ممالک عالمی تجارتی کرنسی ڈالر کو نقصان پہنچانے کے لیے بہت ہوشیاری سے اپنے کارڈز استعمال کر رہے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ امریکی ٹیرف نے برطانیہ، یورپ اور ایشیا کی معیشتوں کو بھی نقصان پہنچایا ہے اور انڈیا سمیت کئی ممالک کے مرکزی بینک سونا خرید کر اپنی کرنسیوں کو سپورٹ کر رہے ہیں۔

معاشی بحران یا کساد بازاری کی صورت میں سونے کے ذخائر کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟

دنیا کے کئی ممالک کے مرکزی بینک سونا خرید رہے ہیں لیکن کیا مرکزی بینک کے پاس موجود سونے کے ذخائر اُس ملک کے اقتصادی بحران کو ختم کر سکتے ہیں۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ملک دیوالیہ ہونے والا ہو تو مرکزی بینک سونے کے ذخائر بیچ کر ادائیگیاں کرتے ہیں لیکن پاکستان کی تاریخ میں ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔

تجزیہ کاروں کے مطابق سونا بحیثیت محفوظ اثاثہ کسی بھی ملک کی اقتصادی ساکھ کے لیے اہم ہے۔

سابق گورنر سٹیٹ بینک سلیم رضا نے بی بی سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ کسی ملک کے سونے کے ذخائر جب بیچنے پڑ جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ملک دیوالیہ ہو چکا ہے اور اس کے پاس بیرونی تجارت اور ادائیگیوں کے لیے اب رقم نہیں بچی۔

شمس السلام کا کہنا ہے کہ مرکزی بینک کرنسی کی قدر مستحکم کرنے کے لیے اکثر اقدامات کرتے ہیں۔

'کبھی وہ مارکیٹ میں ڈالر فروخت کر دیتے تا کہ کرنسی اتار چڑھاؤ کا شکار نہ ہو اور کبھی مارکیٹ میں موجود اضافی ڈالر خرید لیتے ہیں۔'

انھوں نے کہا کہ حال ہی میں امریکی ٹیرف کے بعد انڈین کرنسی کی قدر کم ہو رہی ہے اور ایسے میں کئی بار انڈیا کے مرکزی بینک نے مارکیٹ میں ڈالر فروخت کر کے کرنسی کو مستحکم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

سعودی ایئر لائن کی سابق فلائٹ اٹینڈنٹ آسیہ رضوی کراچی میں اپنے ریسٹوران کے ذریعے مشرق وسطیٰ کے ذائقے پیش کر رہی ہیں۔

کراچی کے پوش علاقے ڈیفنس کی ایک پرسکون گلی میں واقع کیفے 1947 میں ہر دن مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک کا ذائقہ دستیاب ہوتا ہے۔

یہ کیفے کسی پیشہ ور شیف کا نہیں، بلکہ سعودی ایئر لائن کی سابق فلائٹ اٹینڈنٹ آسیہ رضوی کے خواب اور ان کے بیٹے کی امید سے جڑی کہانی ہے۔

آسیہ نے اپنی زندگی کے 15 سال فضائی ملازمت میں گزارے،

کیفے 1947

مشرق وسطیٰ کے ذائقوں اور فلسطین سے اظہار یکجہتی کا منفرد انداز

جس کے بعد وہ اپنے اہلخانہ کے ہمراہ یہ ریستوران چلا رہی ہیں، جس میں ان کے شوہر، بیٹی اور دو بیٹے بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

انہوں نے انڈپینڈنٹ اردو سے گفتگو میں بتایا کہ یہ ریستوران انہوں نے صرف ذائقوں کی محبت میں نہیں بلکہ اپنے 12 سالہ بیٹے شبر علی کے لیے کھولا، جنہیں ڈاؤن سنڈروم ہے۔

آسیہ نے بتایا کہ ان کے بیٹے کو بیکنگ کا شوق ہے اور وہ اچھے کھانے کے شوقین ہونے کے ساتھ اچھا کھانا بنانے کے بھی شوقین ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ وہ ایک دن بہترین بیکر بنیں۔

انہوں نے بتایا: 'میرا مقصد صرف کاروبار کرنا نہیں تھا، بلکہ اپنے بیٹے کے لیے ایک ایسا محفوظ، باعزت اور بااختیار ماحول پیدا کرنا تھا جہاں وہ سیکھ سکے، کام کر سکے اور خود مختار بن سکے۔'

'کیفے 1947 بائے ایس اینڈ آر' کا نام محض ایک تاریخی حوالہ نہیں بلکہ آسیہ کے بیٹے شبّر اور ان کے ایک رشتے دار کے بیٹے رضا کے ناموں کے ابتدائی حروف کا امتزاج ہے۔ رضا آٹزم کا شکار ہیں۔

اور چونکہ سال 1947 میں پاکستان وجود میں آیا تھا، لہٰذا اسی سال کی یاددہانی اس کیفے کی روح میں بسائی گئی ہے۔

فلائٹ اٹینڈنٹ کی حیثیت سے آسیہ نے سعودی عرب، لبنان، فلسطین، مصر اور دیگر عرب ممالک کے کلچر اور کھانوں کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔

انہوں نے بتایا کہ دنیا کے 51 مختلف ممالک کی خواتین ساتھیوں کے ساتھ وہ ہاسٹل میں ہوتی تھی اور ملازمت کے 15 سالوں کے دوران انہوں نے ہر ساتھی سے ان کے ملک کے ثقافتی کھانوں کی تراکیب نہ صرف سیکھیں بلکہ ان کے ساتھ کھانے پکانے کے تجربات، ذائقوں اور روایات کا بھی تبادلہ کرتی رہیں۔

اس کیفے کی خاص بات یہاں کا 'کیوزین آف دی ڈے' ہے، یعنی ہر دن کسی ایک ملک کا نیا ذائقہ یہاں دستیاب ہوتا ہے۔

ان کے کیفے کے ہفتہ وار متغیر مینو میں پیر کو افغانی کھانے، منگل کو چینی، بدھ کو پاکستانی، جمعرات کو مغلئی، جمعے کو فلسطینی اور ہفتہ و اتوار کو مڈل ایسٹرن و فیوژن ڈشز شامل ہیں۔

ہر جمعے کو کیفے 1947 میں فلسطینی کھانوں کی خوشبو پھیلتی ہے، جہاں مسخن، مقلوبہ اور دیگر روایتی پکوان یہاں آنے والوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔

آسیہ کے مطابق: 'فلسطین کے عوام کے ساتھ اپنی یکجہتی کا اظہار کرنے کے لیے ہم نے ان کے قومی ذائقوں کو اپنے مینیو کا حصہ بنایا ہے۔ ہمارا مقصد ہے کہ لوگ کھانے کے ذریعے ان کی جدوجہد کو یاد رکھیں اور محسوس کریں۔'

مزید برآں فلسطینی پکوانوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی ایک خاص آمدنی انسانی فلاحی کاموں کے لیے وقف کی جاتی ہے، تا کہ اس حمایت کا عملی پہلو بھی سامنے آ سکے۔

کیفے کا ماحول بھی عام ریستورانوں سے بالکل مختلف ہے۔ دیواروں پر لگے ہوئے پرانے نقشے، بھاری لکڑی کی کرسیاں، میزوں پر دسترخوان اور ایک چھوٹا سا کتابوں کا گوشہ، سب مل کر ایک نہایت پرسکون ماحول فراہم کرتے ہیں۔

جودھ پور

وہ ہندو اکثریتی ریاست جو پاکستان کا حصہ بنتے بنتے رہ گئی

جودھ پور کی شاہی ریاست، برطانوی ہندوستان میں بمبئی اور کراچی کے درمیان چلتی 'سندھ میل' نام کی مسافر ریل گاڑی کے راستے میں آتی تھی۔

سنہ 1947 میں جب برصغیر برطانوی تسلط سے آزاد ہوکر انڈیا اور پاکستان میں تقسیم ہوا تو جودھ پور برصغیر کے رقبے میں ایک تہائی اور آبادی میں چوتھائی ان لگ بھگ 600 شاہی ریاستوں میں شامل تھا جنھیں فیصلہ کرنا تھا کہ آزاد رہیں یا کسی ایک ملک سے جُڑیں۔

تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ اگر وائسرائے لوئی ماؤنٹ بیٹن کا دباؤ نہ ہوتا تو جودھ پور شاید پاکستان سے الحاق کر لیتا اور اس سے جڑی کئی اور ریاستوں کو بھی اس پر آمادہ کیا جاسکتا۔

اگر ایسا ہو جاتا تو کم از کم وہ رابطہ نہ ٹوٹتا جو تقسیمِ ہند کے بعد بین الملکی ٹرین سے جودھ پور کا پاکستانی شہروں حیدرآباد اور کراچی سے کبھی رہا کبھی نہیں۔

لوگ جودھ پور اور آس پاس کی ریاستوں کے راجاؤں کے تعاون سے بنی جودھ پور سے حیدرآباد تک 650 کلومیٹر طویل پٹڑی پر اس ٹرین میں سفر کرتے رہتے، جسے صحافی اے بی آر یسر کے مطابق 'راجا جی ریل' (راجا کی ریل) بھی کہا جاتا تھا۔

'راجستھان میں تقریباً ہر چار سال بعد خشک سالی آتی تھی، اور قحط زدہ لوگ اناج کی تلاش میں اسی ٹرین پر زرخیز سندھ آتے۔ کچھ یہیں آباد ہو جاتے جبکہ کچھ اپنے گھروں کے لیے چاول اور گندم خرید کر واپس چلے جاتے۔'

انسائکلو پیڈیا برٹینیکا کی تحقیق ہے کہ سنہ 1818 میں برطانوی عمل داری میں آئی جودھ پور، انتظامی اکائی راجپوتانہ ایجنسی کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس کا علاقہ انڈیا کی موجودہ ریاست راجستھان کے وسطی اور جنوب مغربی حصوں کے بیشتر علاقے پر مشتمل تھا۔ جودھ پور نے 1949 میں باضابطہ طور پر راجستھان میں شمولیت اختیار کی تھی۔

شاہی ریاستوں کا مرتبہ توپوں کی سلامی کی تعداد (زیادہ سے زیادہ 21) سے طے ہوتا تھا۔ جودھ پور کے راجا کو 15 توپوں کی سلامی کا درجہ حاصل تھا۔

جان ژُبرزِسکی نے اپنی کتاب 'ڈی تھرونڈ: پٹیل، مینن اینڈ دی انٹیگریشن آف پرنسلی انڈیا' میں لکھتے ہیں کہ اگر (بانی پاکستان محمد علی) جناح اپنی قراقلی ٹوپی کے لیے کوئی نایاب جواہر تلاش کر رہے تھے تو وہ جودھ پور ہوتا۔

کرسٹوفر سنیڈن نے اپنی کتاب 'انڈرسٹینڈنگ کشمیر اینڈ کشمیریز' میں لکھا کہ جناح نے مسلم اکثریتی ریاستوں کو پاکستان میں شامل ہونے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ غیر مسلم حکمرانوں مثلاً برودا، اندور اور ٹراونکور سے بھی یہ کہا کہ اگر وہ پاکستان میں شامل ہونے سے ہچکچاتے ہیں تو انڈیا سے علیحدگی اختیار کر لیں تا کہ انڈیا کا رقبہ کم سے کم رہے۔

'جناح نے ہندو اکثریتی ریاستوں کو بھی پاکستان میں شامل ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور انھیں ایک طرح کا 'خالی چیک' پیش کیا: یعنی ہندو حکمران اپنی شرائط پر پاکستان میں شمولیت اختیار کر سکتا تھا۔ ان میں سب سے اہم ریاست جودھ پور تھی، جو جغرافیائی طور پر پاکستان کے ساتھ متصل تھی اور بآسانی پاکستان میں شامل ہو سکتی تھی۔'

'جودھ پور کو انڈیا میں شامل کرنا ایک نازک معاملہ تھا کیونکہ اس کے ہندو حکمران نے انڈیا میں شمولیت پر آزادی سے ایک ہفتہ قبل ہی رضامندی ظاہر کی۔ یہ فیصلہ اس وقت ممکن ہوا جب انڈین حکومت کی طرف سے کچھ اہم رعایتیں دی گئیں اور آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے سخت دباؤ ڈالا گیا۔'

ایچ وی ہاڈسن اپنی کتاب 'دی گریٹ ڈیوائڈ' میں لکھتے ہیں کہ جودھ پور بہترین مثال ہے کہ جناح کس حد تک جانے کو تیار تھے تا کہ چند ریاستوں کو پاکستان سے ملایا جا سکے اور اس کے برعکس لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان کوششوں کو روکنے کے لیے کس قدر سرگرم تھے۔

'پاکستان کی سرحد سے متصل جودھپور ایک راجپوت ریاست تھی۔ وہاں کی آبادی زیادہ تر ہندو تھی اور حکمران بھی ہندو تھا۔ مہاراجا نے جناح اور دیگر مسلم رہنماؤں، بشمول نوابِ بھوپال، سے کئی ملاقاتیں کیں اور وہ تقریباً پاکستان میں شمولیت پر آمادہ ہو چکے تھے۔'

ژُبرزِسکی لکھتے ہیں کہ 'ریاست نے اپریل 1947 میں دستور ساز اسمبلی میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور مہاراجا اُمید سنگھ پُرعزم تھے کہ ان کی ریاست کا مستقبل انڈین یونین کے ساتھ ہے مگر دو ماہ بعد ان کی اچانک موت سے اقتدار ان کے بیٹے ہنونت سنگھ کو منتقل ہوا۔'

'نوجوان، کم تجربہ کار، وجیہہ مگر ضدی ہنونت سنگھ کو ہوابازی، انگریز دلہنوں، رقص کی محفلوں اور جادوگری سے خاص شغف تھا۔ جادوگری کا شوق اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ بعد میں لندن کے معروف میجک سرکل کے رکن بھی منتخب ہوئے۔'

ژُبرزِسکی کے مطابق گدی سنبھالنے کے بعد ہنونت سنگھ نے اعلان کیا کہ ان کی ریاست دستور ساز اسمبلی میں شامل رہے گی۔ ان کی تخت نشینی کی تقریب میں بھوپال کے نواب حمید اللہ خان کی موجودگی، جو دستاویزِ الحاق کو 'موت کا پروانہ' قرار دیتے تھے، اس قیاس کو جنم دیتی تھی کہ وہ نئے راجا کو جناح کے قریب لانا چاہتے ہیں۔

'اگست کے اوائل میں جودھ پور کے دیوان کا ڈمبی وینکٹا چار نے ماؤنٹ بیٹن کو اطلاع دی کہ ہنونت سنگھ نے آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ جناح سے ایک ملاقات کے بعد ہوا، جس میں حمید اللہ اور مسلم لیگ کے قانونی مشیر محمد ظفر اللہ خان بھی موجود تھے۔'

'جناح سیدھا مدعا پر آئے۔ انھوں نے ہنونت سنگھ کو پیشکش کی کہ جودھپور اگر 15 اگست کو آزادی کا اعلان کر کے پاکستان سے الحاق کر لے تو اسے کراچی بندرگاہ کے آزادانہ استعمال، اسلحے کی درآمد کی آزادی، جودھ پور تا حیدرآباد (سندھ) ریلوے پر اختیار، اور قحط زدہ علاقوں کے لیے غلے کی فراہمی جیسی مراعات دی جائیں گی (جودھ پور تا حیدرآباد ریلوے وہی ہے جس کا ابتدا میں ذکر ہے)۔

ژُبرزِسکی کے مطابق اگرچہ جودھ پور کی صرف 22 فیصد آبادی مسلمان تھی لیکن جناح کی پیشکش میں ایک تاریخی منطق ضرور تھی۔ قدیم زمانے میں جودھ پور کے زیرِنگیں علاقے مشرقی سندھ کے عمرکوٹ سے لے کر دریائے سندھ کے کنارے واقع حیدرآباد تک پھیلے ہوئے تھے۔

'سنہ 1843 میں جنرل سر چارلس نیپئر کے سندھ پر قبضے کے بعد یہ علاقے جودھ پور سے چھن گئے تھے اور بطورِ تاوان ریاست کو محض سالانہ دس ہزار روپے کرایہ دیا جانے لگا تھا جو تقریباً ایک صدی تک نہیں بڑھایا گیا۔'

مورخ کے ایم پنیکر کے مطابق 'مہاراجا پاکستان کی مدد سے پورے راجستھان کا ایک طرح سے شہنشاہ بننے کے خواب سے مسحور ہو گئے تھے۔'

ژُبرزِسکی لکھتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن ایک وقت میں نوابِ بھوپال حمید اللہ خان کو ہندوستان میں اپنا دوسرا بہترین دوست قرار دیتے تھے۔ 'یہاں تک کہ جولائی 1947 تک وہ انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جناح کو قائل کریں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے ایک ہی گورنر جنرل (یعنی خود ماؤنٹ بیٹن) ہوں۔'

'مگر اب دونوں ایک دوسرے کے مخالف خیموں میں تھے۔ جب ماؤنٹ بیٹن کو ہنونت سنگھ اور جناح کی ملاقات کی خبر ملی تو وہ خفا ہوئے۔'

'نواب حمید اللہ کا مؤقف مگر اخلاقی تھا۔ وہ طویل عرصے سے ماؤنٹ بیٹن کو سمجھا رہے تھے کہ تقسیم کا منصوبہ دراصل ریاستی ہندوستان اور بالادستی (پیراماؤنٹسی) کے نظریے کے زوال کا سبب بنے گا۔ انھوں نے 15 جون 1947 کو ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ 'کسی نے یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ ریاستوں کا ردِعمل کیا ہوگا۔ دراصل ریاستوں کو اس طرح نظرانداز کیا گیا، جیسے وہ ہندوستان کا حصہ ہی نہ ہوں۔'

ژُبرزِسکی لکھتے ہیں کہ 'ماؤنٹ بیٹن نے ان کے دلائل رد کر کے انھیں انڈیا سے الحاق کا مشورہ دیا۔ اس کے جواب میں نواب نے ایک طویل خط لکھا، جس میں انھوں نے کانگریس پر الزام لگایا کہ وہ ریاستوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے جبر، رشوت اور دھونس جیسے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔'

'ان کا مزید کہنا تھا کہ برطانوی حکومت بھی ان حربوں میں کانگریس کی

پشت پناہی کر رہی ہے۔ انھوں نے تلخی سے پوچھا 'کیا ہم ایک خالی چیک لکھ دیں اور اسے کانگریس کے رہنماؤں کے حوالے کر دیں کہ وہ اس پر اپنی مرضی کی رقم بھریں؟''

زُبرزِسکی لکھتے ہیں کہ بعد ازاں نواب حمید اللہ نے اُدَے پور کے مہارانا بھوپال سنگھ کو ہدف بنایا۔ ان کے اصرار پر ہنونت سنگھ نے کوشش کی کہ مہارانا کو پاکستان سے الحاق پر آمادہ کریں۔ اس منصوبے کے پیچھے منطق یہ تھی کہ اُدے پور مغرب میں جودھ پور اور وسطی ہند کی ریاستوں اندور اور بھوپال کے درمیان رابطے کی ایک کڑی تھا۔

'اگر مہارانا راضی ہو جاتے تو بھوپال، اندور کے راستے پاکستان سے زمینی اتصال حاصل کر لیتا اور یوں نواب حمید اللہ اپنی دیرینہ خواہش پوری کر سکتے تھے۔'

'لیکن جودھ پور کے دیوان وینکٹا چار نے حکومتِ ہند کے سیکرٹری برائے داخلہ امور ایچ وی آر آینگر کو ایک خاص قاصد کے ذریعے دستی نوٹ بھجوایا کہ حکمران سے جناح نے رابطہ کیا اور انھیں انڈین ڈومینین سے باہر رہنے پر آمادہ کر لیا۔ آینگر نے فوراً وہ نوٹ (سردار) پٹیل کو دکھایا جنھوں نے کہا کہ اگر جودھ پور، اُدَے پور، اِندور، بھوپال کا اتحاد بن گیا تو یہ 'انڈیا کے دل میں خنجر' کے مترادف ہوگا۔'

زُبرزِسکی لکھتے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ آخری ملاقات میں جناح نے ڈرامائی انداز میں اپنا دستخط شدہ ایک خالی صفحہ مہاراجا ہنونت سنگھ کے حوالے کیا اور کہا کہ 'اپنی تمام شرائط خود لکھ لیں۔'

'ایک لمحے کو لگا کہ مہاراجا واقعی ایسا کر لیں گے مگر عین وقت پر ان کے اے ڈی سی، کرنل ٹھاکر کیسری سنگھ نے مداخلت کی اور انھیں ماں سے مشورہ کیے بغیر دستخط کرنے سے روک دیا۔ ہنونت سنگھ جودھ پور واپس گئے، جہاں ماں اور گرو دونوں نے انھیں سمجھایا کہ ایک ہندو ریاست کا مسلم اکثریتی ملک سے الحاق تباہ کن ہوگا۔'

ہاڈسن لکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ جناح سے آخری ملاقات میں موجود جیسلمیر کے مہاراج کمار نے کہا کہ وہ پاکستان میں صرف ایک شرط پر شامل ہوں گے کہ اگر ہندو اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا تو وہ مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اس بات نے مہاراجا جودھ پور کو جھنجھوڑ دیا۔

اس کے بعد زبرزسکی کے مطابق وہ دلی میں ماؤنٹ بیٹن سے ملے۔

لیکن ہاڈسن نے لکھا کہ مہاراجا کو دلی میں وائسرائے ہاؤس طلب کیا گیا تو ماؤنٹ بیٹن نے انھیں سمجھایا کہ اگرچہ انھیں قانونی طور پر پاکستان میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے مگر اس فیصلے کے نتائج پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ یہ تقسیم کے اصولوں کے خلاف ہوگا اور ریاست میں فرقہ وارانہ فساد کو ہوا دے سکتا ہے۔

زبرزسکی کے مطابق وائسرائے نے مہاراجا سے کہا کہ وہ ان کے والد کے دوست رہے ہیں اور یقیناً ان کے والد انڈیا کے ساتھ ہوتے۔

ہاڈسن نے لکھا ہے کہ 'لیکن جب یہ دلیل بھی کارگر نہ ہوئی تو وی پی مینن نے مہاراجا کو یقین دلایا کہ انڈیا وہ تمام رعایتیں دے گا جن کا جناح نے وعدہ کیا: اسلحے کی درآمد، قحط زدہ علاقوں کے لیے خوراک اور بندرگاہ تک ریل کی تعمیر۔ انھوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ آپ پاکستان کے ساتھ جا ہی نہیں سکتے۔ آپ کے جاگیردار، عوام اور حتیٰ کہ آپ کی والدہ بھی اسے قبول نہیں کریں گے۔'

وپیلا پنگونی (وی پی) مینن کو انڈیا کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے شاہی ریاستوں کو انڈیا میں شامل کرنے کا کام سونپا تھا۔

ہاڈسن نے لکھا کہ آخر میں سردار پٹیل نے فیصلہ کن وار کیا کہ 'آپ چاہیں تو انڈیا سے باہر رہ سکتے ہیں لیکن اگر اس کے نتیجے میں آپ کی ریاست میں بدامنی ہوئی تو انڈیا کی حکومت آپ کی کوئی مدد نہیں کرے گی۔'

یہ سنتے ہی مہاراجا کے پسینے چھوٹ گئے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ 'میں ابھی ماؤنٹ بیٹن کے پاس جا کر الحاق پر دستخط کرتا ہوں۔'

دستخط کے بعد مینن کے بقول مہاراجا نے اچانک 'ریوالور' نکال کر کہا کہ 'میں آپ کی ڈکٹیشن قبول نہیں کرتا۔'

مینن نے سرد لہجے میں جواب دیا کہ 'یہ بچوں جیسے تماشے بند کریں۔'

اونکار سنگھ ببرا نے 'ایک مہاراجا کی انتر کتھا' میں لکھا ہے کہ یہ ایک مذاق تھا۔ 'ریوالور' دراصل سونے کی ملمع کاری کیا ہوا ایک قلم تھا۔

زبرزسکی کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے بھی اس واقعے کو ہنسی میں اڑا دیا۔ برسوں بعد، مہاراجا نے وہ قلم تحفے میں ماؤنٹ بیٹن کو دے دیا، جنھوں نے اسے بعد میں 'میجک سرکل' کے میوزیم کو عطیہ کر دیا۔ 2013 میں یہ قلم برطانیہ کے رائل آرموریز میوزیم کو تیرہ ہزار پاؤنڈ میں فروخت ہوا۔

'اگرچہ جودھ پور نے بالآخر انڈیا سے الحاق کر لیا مگر انڈیا کے لیے اصل اطمینان کی بات یہ تھی کہ ادے پور کے راجا بھوپال سنگھ نے پاکستان کی پیشکش ٹھکرا دی۔'

ہاڈسن کے مطابق انڈیا کی ریاستی وزارت کو خوف تھا کہ اگر جودھ پور پاکستان سے جا ملا تو دوسرے راجپوت حکمران، جیسے ادے پور، بھی اسی راہ پر چل سکتے ہیں، جس سے پاکستان کے ساتھ ایک متصل راجپوت اتحاد بن سکتا تھا۔ لیکن جودھ پور، جیسلمیر اور بیکانیر، جن میں بیکانیر کے راجا نے انڈیا سے الحاق کی مہم میں سب سے آگے بڑھ کر کردار ادا کیا، سب نے آخر کار انڈیا سے الحاق کے دستاویز پر دستخط کر دیے۔

ہاڈسن کا تجزیہ ہے کہ اس وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ریاستوں کے معاملے میں ایک عظیم کامیابی کا احساس ہوا۔ تمام توقعات کے برعکس، زیادہ تر ریاستوں نے انڈیا یا پاکستان میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور وہ افراتفری اور بغاوت جس کا خطرہ برطانوی اقتدار کے خاتمے پر تھا، ٹل گئی تھی۔

وہ لکھتے ہیں 'لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ پالیسی سب سے پہلے راجاؤں کے سامنے رکھی تھی۔ انھوں نے خود کہا تھا کہ 'یہ میری سکیم ہے'۔ انھوں نے ہر موقع پر اسے نافذ کرنے کے لیے ذاتی طور پر مداخلت کی، خاص طور پر مشکل حالات میں۔'

جدید جنوبی ایشیا کے مورخ یعقوب خان بنگش کے مطابق جب ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجا کو طلب کر کے عملاً انھیں انڈیا سے الحاق پر مجبور کیا 'یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن بطور وائسرائے اور گورنر جنرل کا کس حد تک انڈیا کے حق میں جھکاؤ تھا حالانکہ جودھ پور کو اختیار حاصل تھا کہ وہ انڈیا یا پاکستان میں سے کسی ایک سے الحاق کرے یا آزاد ریاست کے طور پر قائم رہے۔'

بنگش کتاب 'اے پرنسلی افیئر: دی ایکسیشن اینڈ انٹیگریشن آف دی پرنسلی سٹیٹس آف پاکستان 1947-1955' کے مصنف ہیں۔

انھوں نے بی بی سی کو بتایا کہ اسی طرح اِندور کے مہاراجا نے بھی جناح صاحب سے استفسار کیا تھا کہ اگر وہ پاکستان سے الحاق کریں تو اس کی شرائط اور ممکنہ فوائد کیا ہوں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جودھ پور واحد ہندو اکثریتی ریاست نہیں تھی جسے پاکستان سے الحاق میں دلچسپی تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ 'اگر جودھ پور پاکستان سے الحاق کر لیتا تو راجستھان کی کئی دیگر ریاستوں کو بھی اس راستے پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ جودھ پور چونکہ راجستھان کے وسط میں واقع ہے، اس لیے اس کے پاکستان میں شامل ہونے سے جے پور، اُدے پور اور الوَر پر دباؤ بڑھ جاتا، اور اگر اِندور بھی پاکستان کا حصہ بن جاتا تو برصغیر کے نقشے میں پاکستان کی جغرافیائی وسعت میں ڈرامائی اضافہ ہو جاتا۔'

تاہم ایسا نہ ہو سکا۔

بنگش کے مطابق 'اگر یہ سب ہو جاتا تو یقیناً انڈیا کا ردِعمل شدید ہوتا کیونکہ یہ سب ہندو اکثریتی ریاستیں تھیں جن کے حکمراں بھی ہندو تھے۔ یوں پاکستان کا 'مسلم ریاست' ہونے کا نظریاتی دعویٰ بھی کسی حد تک متاثر ہوتا۔'

'لیکن ماؤنٹ بیٹن نے جودھ پور اور اندور پر دباؤ ڈال کر ایسا ہونے نہیں دیا تاکہ پاکستان کی کہانی اس سمت میں آگے بڑھ ہی نہ سکے۔'

’ابھرتے ٹیلنٹ کی مدد کریں‘

گلوکار فلک شبیر کی ’پاکستان آئیڈل‘ کو اپنے گانے استعمال کرنے کی اجازت

میوزیکل شو ’پاکستان آئیڈل‘ کا دوسرا سیزن جاری ہے اور اس میں حصہ لینے والے افراد کے گانوں کی ویڈیو کلپس اکثر ہی سوشل میڈیا پر نظر آتی ہیں اور ان کو سراہا بھی جاتا ہے۔

لیکن جہاں اس شو میں لگنے والے سُروں کو سوشل میڈیا صارفین میں پذیرائی مل رہی ہے وہیں لوگ ’پاکستان آئیڈل‘ میں ایک کمی بھی محسوس کر رہے ہیں جو نئے گانوں کی ہے۔

اسی کمی کا برملا اظہار پاکستانی گلوکار سجاد علی نے بھی حال ہی میں کیا۔ کینیڈا میں نیوز کانفرنس کرتے ہوئے سجاد علی کا کہنا تھا کہ شو میں شامل اُمیدوار اُن سمیت بہت سے دیگر گلوکاروں کے گانے نہیں گا رہے کیونکہ شو کی انتظامیہ کے پاس ان گانوں کے کاپی رائٹس نہیں۔

سجاد علی کا دعویٰ ہے کہ پاکستان آئیڈل کی انتظامیہ نے کاپی رائٹس کے لیے اُن سے رابطہ کیا تھا لیکن بجٹ پر اتفاقِ رائے نہ ہونے سے یہ معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

سجاد علی کا کہنا تھا کہ اس کی ذمہ داری منتظمین پر عائد ہوتی ہے جو بروقت اُن کے گانوں اور دیگر موسیقاروں کے گانوں کے حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

تاہم بدھ کے روز معروف پاکستانی گلوکار فلک شبیر نے انسٹاگرام سٹوری میں لکھا کہ ’میں پاکستان آئیڈل کو اپنے تمام گانوں کو استعمال کرنے کی مکمل اجازت دیتا ہوں تاکہ وہ ابھرتے ٹیلنٹ کی مدد کریں اور ہمارے ملک کی صلاحیتوں کو عالمی سطح پر اجاگر کریں۔‘

انھوں نے مزید یہ بھی لکھا کہ ’میں پاکستان آئیڈل کے ججز اور تمام باصلاحیت شرکا کی بھرپور حمایت کرتا ہوں۔‘

اُن کی جانب سے سامنے آنے والے اس بیان کے بعد پاکستان آئیڈل نے اُن کی پوسٹ کو دوبارہ شیئر کیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

واضح رہے کہ پاکستان آئیڈیل کو لگ بھگ ایک دہائی کے بعد شروع کیا گیا اور اس کا دوسرا سیزن جاری ہے۔ معروف گلوکار راحت فتح علی خان، بلال مقصود، فواد خان اور زیبا بنگش ججز کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

سجاد علی کے بیان پر سوشل میڈیا صارفین بھی ردِعمل دے رہے ہیں۔ بعض سجاد علی کے موقف کو درست قرار دے رہے ہیں جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ ’پاکستان آئیڈل‘ پاکستان کا شو ہے، لہٰذا اس کے لیے ہر سنگر کو اپنے گانوں کی اجازت دینی چاہیے۔

بی بی سی نے سجاد علی کے بیان پر دیگر گلوکاروں اور اس شعبے سے منسلک افراد سے بات کر کے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان آئیڈل جیسے شو میں ہر گلوکار کے گانوں کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں؟ اور کیا اتنے بڑے بجٹ کے ساتھ کیے جانے والے ان شوز کے لیے بڑے گلوکاروں کے ساتھ معاملات کیوں نہیں طے پا سکے۔

پہلے جان لیتے ہیں کہ سوشل میڈیا پر اس پر کیا بات ہو رہی ہے۔

’سجاد علی بھی اپنے کریئر کے آغاز پر لتا کے گانے گاتے تھے‘

سجاد علی کے بیان پر انسٹاگرام پر اپنی پوسٹ میں لیو جان نامی صارف نے لکھا کہ ’سجاد علی اپنے کریئر کے بارے میں کہا کہیں گے۔ وہ اپنے کریئر کے آغاز میں لتا کے گانے گاتے رہے ہیں۔‘

بشا نامی صارف نے سجاد علی کی حمایت میں لکھا کہ انھیں اس شو میں بطور جج شامل کیا جانا چاہیے تھے۔

نویرا خان لکھتی ہیں کہ ’پاکستان میں اگر کوئی اچھی چیز ہو رہی ہے تو ہونے دیں، غیر ضروری طور پر تنازع کھڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔‘

معروف سنگر جواد احمد کہتے ہیں کہ وہ سجاد علی کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔

بی بی سی اُردو سے گفتگو کرتے ہوئے جواد احمد کا کہنا تھا کہ سجاد احمد کو اپنا دل بڑا کرنا چاہیے۔

اُن کے بقول اگر آپ کے گانے کوئی ٹی وی پر آ کر گا دیتا ہے یا کسی میوزیکل شو میں کوئی اُمیدوار یہ گاتا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

جواد احمد نے سجاد علی کا نام لیے بغیر کہا کہ ’آپ نے بھی ساری زندگی لوگوں کے گانے گائے ہیں، اگر کوئی نیا بچہ آپ کا گانا گانا چاہتا ہے تو اسے اجازت دیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔‘

جواد احمد کہتے ہیں کہ ’پاکستان میں ویسے ہی بہت کم میوزیکل پروگرام ہوتے ہیں، یہ تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے جس کو سراہا جانا چاہیے۔‘

جواد احمد کا کہنا تھا کہ پاکستان میں آرٹسٹ اور گلوکار دیگر شعبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پیسہ کماتے ہیں۔

اُن کا کہنا تھا کہ ’یہ لوگ پرائیویٹ فنکشن بھی کرتے ہیں اور دُنیا بھر میں کنسرٹس کرتے ہیں۔۔ ہمارے ملک میں کتنے لوگوں کی ایسی زندگی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو اربوں، کروڑوں روپے کماتے ہیں۔‘

جواد احمد کہتے ہیں کہ اگر کوئی اُن کے گانے گانا چاہتا ہے تو اُنھیں کاپی رائٹس جیسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی فنکار چینل انتظامیہ سے ایسا مطالبہ کرتا ہے تو اُنھیں بھی چاہیے کہ اگر کوئی فنکار کاپی رائٹس کلیم کر رہا ہے تو اس کے ساتھ معاہدہ کر لیں۔

تاہم گلوکار حسن جہانگیر، جواد احمد سے اتفاق نہیں کرتے۔ بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے اُن کا کہنا تھا کہ دُنیا بھر میں کاپی رائٹس کے معاملات کو سنجیدگی سے دیکھا جاتا ہے۔

اُن کا کہنا تھا کہ سجاد علی، علی ظفر، علی عظمت یہ بڑے گلوکار ہیں، اگر پاکستان آئیڈل والے ان سے بات کر لیتے تو ان کے گانے بھی شو میں شامل ہو جاتے۔

حسن جہانگیر کے بقول شو میں شامل زیادہ تر افراد پرانے گا رہے ہیں، جو پہلے بھی بہت دفعہ مختلف میوزیکل شوز میں چل چکے ہیں۔

اُن کا کہنا تھا کہ نوجوان نسل عاطف اسلم، سجاد علی اور علی ظفر جیسے گلوکاروں کو پسند کرتی ہے۔ لیکن ان گلوکاروں کے گانوں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔

پاکستان کی میوزک انڈسٹری پر نظر رکھنے والے صحافی عمیر علوی کہتے ہیں کہ نوے کی دہائی میں ہونے والے میوزک شوز میں شریک نئے گلوکاروں پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔

بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے اُن کا کہنا تھا کہ کاپی رائٹس کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ ایسے مقابلوں میں اگر کوئی نیا گلوکار کسی معروف سنگر کا گانا گاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سجاد علی کو بھی اپنے گانوں کے رائٹس دے دینے چاہییں۔

پاکستان آئیڈل کے معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے عمیر علوی کا کہنا تھا کہ ابھی تو آڈیشنز چل رہے ہیں، جب مین راؤنڈ اور ووٹنگ شروع ہو گی تو اس میں دلچسپی بڑھے گی۔

پاکستان میں کاپی رائٹس آرڈیننس 1962 کیا ہے؟

ترقی پذیر ممالک میں انٹلیکچوئل پراپرٹی کو اتنی فوقیت نہیں دی جاتی اور یہاں کسی تخلیق کار کی تخلیق کو نقل اور چوری کرنا ایک معمول کی بات ہے جبکہ اس حوالے سے موجود قوانین پر عملدرآمد بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔

اگر بات پاکستان اور انڈیا کی ہو تو دوسری درجنوں مشترک قدروں کے علاوہ موسیقی ایک ایسی چیز ہے جو ان ہمسایہ ممالک میں بسنے والوں کو جوڑتی ہے۔

پاکستان میں اس حوالے سے کاپی رائٹس آرڈیننس 1962 رائج ہے جس میں میوزک یا گانے، میوزیکل ورک یا موسیقی کی کیٹگری میں رجسٹر ہوتے ہیں۔

پاکستان میں انٹلیکچوئل پراپرٹی سے متعلقہ قوانین کے ماہرین کہتے ہیں کہ ایک گانے کے کاپی رائٹس کے مالک افراد چار سے پانچ ہو سکتے ہیں۔

مثلاً گانے کے بول لکھنے والا، گانے کا کمپوزر یا موسیقار، گانے والا یا گلوکار، اور ری مکسنگ کرنے والا۔

بی بی سی نے سنہ 2019 میں اس حوالے سے ایک آرٹیکل شائع کیا تھا جس میں اُس وقت میوزک کمپنی ای ایم آئی پاکستان کے چیف آپریٹنگ آفیسر ذیشان چوہدری کا کہنا تھا کہ آپ کسی دوسرے کے گانے کو مختلف انداز سے گا سکتے ہیں مگر اس کے لیے اجازت ضروری ہے۔

اُن کے بقول ’ایک گانا جس کے رائٹس کسی مخصوص کمپنی یا فرد کے پاس ہیں اس کی اجازت سے کوئی بھی شخص اس گانے کی ریورژننگ (نئے انداز سے گانا) کر سکتا ہے جس کو ’کور سانگ‘ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اجازت اس بات کی بھی لے سکتے ہیں کہ آپ گانے کی کمپوزیشن وہی رکھیں گے مگر اس کے بول ایمپرووائز کریں گے اور یہ کاپی رائٹس کی اڈپٹیشن (موافقت) کہلاتی ہے۔ اسی طرح کسی گانے کی کمپوزیشن میں ایک خاص سُر کو آپ اپنے نئے گانے کے لُوپ میں چلا سکتے ہیں اور اس کو ’سیمپلنگ‘ کہتے ہیں۔‘

ان کا کہنا تھا کہ درحقیقت آپ کسی کا گانا کسی بھی طرح استعمال کر سکتے ہیں مگر اس کے لیے اس گانے کے حقوق رکھنے والے کی اجازت درکار ہوتی ہے اور اگر آپ یہ نہیں لیتے تو آپ کاپی رائٹس کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو پاکستان میں جرم ہے۔

بی بی سی نے سجاد علی کے بیان پر ردِعمل کے لیے پاکستان آئیڈل کی انتظامیہ سے رابطہ کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ سجاد علی کے بیان کا جائزہ لے رہے ہیں جس کے بعد اس بارے میں کوئی بیان جاری کیا جائے گا۔

ٹیکنالوجی کے اعتبار سے دنیا کے پانچ سب سے جدید شہر

جہاں بنا ڈرائیور کے گاڑیاں اور کیش لیس سٹور عام ہیں

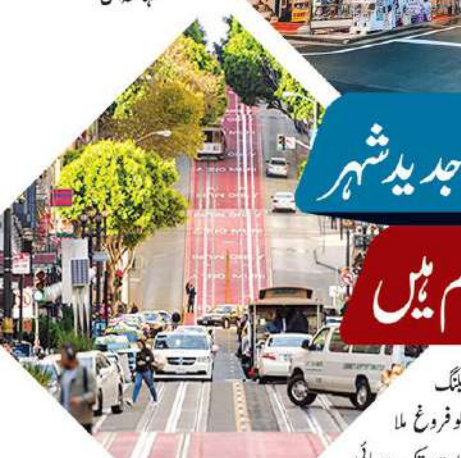

مصنوعی ذہانت (اے آئی) کی مدد سے چلنے والے ذرائع آمدو رفت سے لے کر کیش لیس زندگی تک، گلوبل انوویشن انڈیکس نے ٹیکنالوجی میں جدت کے لحاظ سے دنیا کے جدید ترین شہروں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔

مصنوعی ذہانت کے عروج، خود کار کاروں اور قابلِ تحدید توانائی کے استعمال میں تیزی جیسے رجحانات نے ٹیکنالوجی کے میدان کو یکسر بدل دیا ہے۔

دنیا بھر کے شہروں میں نئی ایجادات ہو رہی ہیں اور پیٹنٹ سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن کچھ شہر دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے جدت کا سفر طے کر رہے ہیں۔

انٹلیکچوئل پراپرٹی آرگنائزیشن کے تحت سالانہ شائع ہونے والی گلوبل انوویشن انڈیکس ایک ایسی فہرست ہے جس میں سرمایہ کاری کی سطح، تکنیکی ترقی اور ان کے سماجی اقتصادی اثرات کی بنیاد پر شہروں کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ دنیا کے سب سے جدید شہروں میں روزمرہ زندگی کیسی ہے، ہم نے پانچ بڑے اختراعی مراکز کے رہائشیوں سے بات کی ہے۔

1۔ چین میں شینزین-ہانگ کانگ-گوانگژو

اس سال چین پہلی مرتبہ گلوبل انوویشن انڈیکس (جی آئی آئی) کے ٹاپ 10 میں شامل ہوا ہے جس کی وجہ چین سے دائر کیے جانے والے پیٹنٹس کی بڑھتی ہوئی تعداد، سائنس وٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری اور وینچر کیپیٹل میں اضافہ ہے۔

جی آئی آئی کی رپورٹ میں ٹیکنالوجی میں جدت کے 100 سرکردہ مراکز کا ذکر کیا گیا۔ ان میں سے 24 چین میں موجود ہیں جس میں جنوبی چین کا ٹیکنالوجی کا مرکز شینزین، ہانگ کانگ اور گوانگژو پہلے نمبر پر ہے۔

اس خطے میں ٹیکنالوجی روزمرہ کی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہے۔

ہانگ کانگ کے رہائشی جیمی ریور کہتے ہیں کہ آپ کسی بھی مقامی بازار چلے جائیں اور دکاندار ادائیگیوں کے لیے کیو آر (QR) کوڈ استعمال کرتے نظر آئیں گے، جبکہ چھوٹے سے چھوٹے دکاندار تین مختلف ایپس کے ذریعے اپنا سامان پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں۔

ہانگ کانگ میں 1997 میں پبلک ٹرانسپورٹ کی ادائیگی کے لیے آکٹوپس کارڈ متعارف کروایا گیا تھا۔ اب اس کارڈ کو وینڈنگ مشینوں سے لے کر پارکنگ میٹر تک ہر چیز کی ادائیگی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ریور نے مسافروں کو مشورہ دیا ہے کہ ہانگ کانگ کی جدید ٹیکنالوجی کا تجربہ کرنے کے لیے وہ رات کے وقت سٹار فیری پر جائیں اور 'سمفنی آف لائٹس' شو دیکھیں۔ یہ 43 عمارتوں پر لائٹس، لیزرز اور ایل ای ڈی سکرینوں کے ساتھ میوزک کا امتزاج ہے۔

ایک سابقہ پولیس سٹیشن میں اب سٹوڈیوز، دکانیں اور کیفے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'آپ کو روایتی خطاطی کے سٹوڈیوز کے ساتھ تھری ڈی پرنٹنگ ورکشاپس نظر آئیں گی۔'

شینزین ہواوے سے ٹینسنٹ تک کئی عالمی کارپوریشنوں کا گھر ہے۔ یہ ماہی گیروں کا ایک گاؤں تھا جسے 1980 میں خصوصی اقتصادی زون کے طور پر نامزد کیا گیا اور چین نے اس جگہ کو ٹیکنالوجی کے انقلاب کے لیے منتخب کیا۔ یہاں ٹیکس میں چھوٹ اور مراعات بھی دی گئی تھیں۔

تخلیقی صلاحیتوں کے مرکز کے طور پر اس کی حیثیت صرف اس وقت بڑھی جب اسے 2008 میں یونیسکو نے سراہا۔ سرمایہ کاری کے ذریعے تخلیقی مقامات جیسے شینزین اوپن انوویشن لیب کو فنڈز فراہم کیے گئے۔

2008 سے ایک رہائشی لیون ہوانگ نے کہا کہ اس کے تحت سکیلنگ اور تجربات کو فروغ ملا اور جدید آلات تک رسائی آسان ہوئی، جیسے ورچوئل ریئلٹی۔

ان کے مطابق یہاں کئی طرح کے لوگ آتے تھے جیسے طلبہ، جدید ٹیکنالوجی کے شوقین افراد اور ہواوے یا ڈی جے آئی جیسی کمپنیوں کے افراد۔

ہوانگ کے مطابق سیاح یہاں پر ڈرون شوز دیکھ سکتے ہیں یا جشن بہارہ اور قومی دن جیسی تقریبات میں شرکت کر سکتے ہیں۔

شہر میں حال ہی میں دنیا کے سب سے بڑے ڈرون شو کا ریکارڈ قائم کیا گیا جس میں قریب 12 ہزار ڈرون شامل تھے۔

2۔ جاپان میں ٹوکیو-یوکوہاما

دوسرے نمبر پر ٹوکیو-یوکوہاما ہیں جہاں دنیا میں سب سے زیادہ عالمی پیٹنٹ فائلنگ کی جاتی ہے۔ یہ عالمی فائلنگ کا 10 فیصد حصہ بنتا ہے۔

تاہم یہاں کے رہائشی جس چیز کی تعریف کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ادھر

ٹیکنالوجی اور جدت پسندی دکھاوے کی نہیں بلکہ عملی طور پر مددگار ہوتی ہے۔

ڈانا یاؤ ٹوکیو میں اپنے شوہر سے ملیں اور اب وہ جاپان اور امریکہ آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'جاپان میں ٹیکنالوجی کا مطلب اڑنے والی کاریں نہیں جیسا کہ ہم 2050 تک اس کی امید لگاتے ہیں۔'

وہ کہتی ہیں کہ اس کے بجائے یہاں ایسا ریل کارڈ ہے جو آپ بسوں اور وینڈنگ مشینوں کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور سٹورز پر ایسے جدید اے آئی سینسر ہیں جو سیلف چیک آؤٹ اور کیش لیس ادائیگی کر سکتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ 'آپ کو ایسی چھوٹی چھوٹی سہولیات ہر جگہ مل جاتی ہیں۔ یہ ہائی ٹیک ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی مددگار رہیں۔'

مسافر ایک ہوٹل میں ٹیکنالوجی کی جدت کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہاں چیک اِن خودکار ہے، عملے میں روبوٹ ہیں اور بہترین نیند کے لیے 'سمارٹ

بیڈ' بستر کا درجہ حرارت کنٹرول کرتے ہیں۔

یاؤ کا کہنا ہے کہ مسافر بغیر ڈرائیور والی ٹرین میں سفر کر سکتے ہیں۔

آرٹ کی تفریح کے لیے لوگ ٹیم لیب پلینٹس جا سکتے ہیں جہاں 'پورا کمرہ آپ کی حرکات پر ردعمل دیتا ہے، جیسے روشنی اور آواز کا سگنل۔'

3۔ سان فرانسسکو، امریکہ

دنیا بھر میں اسے سیلیکون ویلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سان ہوزے۔سان فرانسسکو کلسٹر دنیا بھر میں وینچر کیپیٹل میں سب سے آگے ہے جہاں قریب سات فیصد تمام عالمی معاہدے ہوتے ہیں۔ یہاں فی کس سب سے زیادہ اختراعی سرگرمی پائی جاتی ہے۔

یہی چیز کاروباری افراد اور سٹارٹ اپس کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، خاص طور پر جب اے آئی کے مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔

ٹکٹ فیری نامی کمپنی کے بانی اور سان فرانسسکو کے نئے رہائشی رتیش پٹیل نے کہا کہ 'میں اب تک سان فرانسسکو میں کبھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ یہ ڈاٹ کام بوم (انٹرنیٹ کے عروج) کی طرح ہے۔ یہاں بہت ہوشیار لوگ جمع ہو رہے ہیں اور جو لوگ چلے گئے تھے وہ اب واپس آ گئے ہیں۔'

اس کا مطلب ہے کہ نیٹ ورکنگ کے امکانات ہر جگہ موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'آپ ایک ڈنر میں ان چیلنجز کے بارے میں بات چیت کر سکتے ہیں جن کا آپ کو ایک سٹارٹ اپ کے بانی کے طور پر سامنا ہے اور اگلے ہی لمحے میز پر موجود کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ مدد کر سکتے ہیں۔'

'وہ ایک میسج بھیجتے ہیں اور اچانک آپ کی کسی متعلقہ شخص سے ملاقات ہو جاتی ہے جس تک آپ ای میل یا سوشل میڈیا کے ذریعے کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔'

سان فرانسسکو اور سیلیکون ویلی کے لوگ کوئی ٹیکنالوجی عام ہو جانے سے پہلے ہی اس کی آزمائش کر لیتے ہیں۔

پٹیل کا کہنا تھا کہ 'باقی دنیا کو اس بارے میں چھ ماہ یا ایک سال بعد پتا چلتا ہے۔'

اوبر اور لفٹ نے عالمی سطح کی کمپنیاں بننے سے قبل یہیں اپنے آپریشنز شروع کیے تھے۔ اب خودکار ڈرائیور لیس کاروں کی کمپنی ویمو نے بھی مارکیٹ شیئر حاصل کر لیا ہے۔ کوئی بھی ایپ کو ڈاؤن لوڈ کر کے اس کی نئی سہولیات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسے آزما سکتا ہے۔

4۔ بیجنگ

اس انڈیکس کے مطابق چین کے دارالحکومت بیجنگ نے سائنسی تحقیقی پیداوار میں ہر دوسرے شہر کو پیچھے چھوڑا۔ دنیا بھر میں شائع مطالعوں میں چار فیصد یہاں کے محققین نے کیے۔

لیکن رہائشیوں کا کہنا ہے کہ بیجنگ کی اصل طاقت ہائی ٹیک انفراسٹرکچر اور گہری ثقافتی جڑوں کے درمیان توازن ہے۔

اے آئی کے ماہر ایلی فیرل کنگزلی اب بیجنگ میں رہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'دیگر سمارٹ شہر صرف جدید ٹیکنالوجی پر دھیان دیتے ہیں مگر بیجنگ جدت، ثقافت اور رہنے کی صلاحیت کو یکجا کرتا ہے جو اسے بیک وقت ترقی یافتہ لیکن منفرد بناتا ہے۔'

وہ کہتی ہیں کہ روزمرہ زندگی علی پے اور وی چیٹ جیسی ایپس کے ساتھ چلتی ہے اور ان میں مختلف زبانوں کے ترجمے کی بھی آپشن ہے۔ ان میں کیو آر کوڈ اور کھانا آرڈر کرنے جیسے مفید آپشن ہیں۔

ان کے مطابق انگلش بولنے والوں کے لیے ڈیپ سیک جیسے اے آئی چیٹ بوٹ روزمرہ زندگی آسان بنا دیتے ہیں۔

صرف مایوس کن چیز یہ ہے کہ گھر چھوڑنا اور خدمات تلاش کرنا کہیں اور اتنا آسان نہیں۔

انھوں نے کہا کہ 'یہاں یہ سب بہت اچھی طرح سے کام کرتا ہے۔ آپ کو یہ سروسز چھوڑ کر کہیں اور جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنی جدید سروسز ہیں۔'

'شاذونادر ہی کوئی تکنیکی خرابی ہوتی ہے۔ جب میں دوسرے ممالک کا دورہ کرتی ہوں تو اکثر مایوسی ہوتی ہے۔'

سیاحوں کے لیے بیدو اپولو روبوٹیکسی دستیاب ہے جس میں 'کوئی سٹیئرنگ وہیل ہی نہیں۔'

'آپ اس میں سوار ہوتے ہیں اور کار خود ہی چل پڑتی ہے۔ یہ مستقبل کا منظر پیش کرتا ہے اور آپ کو حیرانی ہوتی ہے۔'

5۔ سیول

انڈیکس کے مطابق پانچویں نمبر پر جنوبی کوریا کا شہر سیول ہے جہاں 4.5 فیصد عالمی پیٹنگ کی درخواستیں آئیں۔ یہ شہر وینچرل کیپل معاہدوں میں ایشیا میں سرِفہرست ہے۔ سان فرانسیسکو کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے۔

رہائشیوں کا کہنا ہے کہ جنوبی کوریا میں ٹیکنالوجی کی ضرورت ہی ایجاد کی ماں ہے کیونکہ اس چھوٹے ملک کے پاس محدود قدرتی وسائل ہیں۔

سیول میں 2024 سے مقیم کرس اوبرمین کا کہنا ہے کہ 'ملک کو اختراعات اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں دوسروں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔'

'بہت سے لوگوں کے دادا دادی غربت میں رہتے تھے اس لیے اب بھی بڑھنے، بہتری لانے، اختراع کرنے اور ہمت نہ ہارنے کا جوش و جذبہ موجود ہے۔'

روزمرہ زندگی میں جدت کے کئی پہلو ملتے ہیں۔ گھروں میں عام طور پر ایسے دروازے ہوتے ہیں جو ڈیجیٹل کوڈز کے ساتھ کھل جاتے ہیں اور کیش لیس ادائیگی کے نظام کا مطلب یہ ہے کہ باہر نکلتے وقت آپ کو صرف اپنے فون کی ضرورت ہوتی ہے۔ 'چابیاں، کارڈز، میرا پرس، نقدی۔ میں ان سب کو گھر پر چھوڑ سکتا ہوں۔'

سیاح شہر کا جدید انفراسٹرکچر چنگچن میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک واک ایبل پلازا ہے جہاں بنا ڈرائیور بسیں چلتی ہیں۔ شہر میں کیش لیس سٹور موجود ہیں جو 24 گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔

صارفین یہاں سے اشیا خرید کر سمارٹ مشین میں ادائیگی کر سکتے ہیں۔ اے آئی کے نظام نہ صرف گودام میں اشیا کی دستیابی پر نظر رکھتے ہیں بلکہ چوری کو بھی روکتے ہیں۔

بابراعظم کیا واپس 'ڈرائنگ بورڈ' پر جائیں گے؟

یہ بابراعظم کا وہ رُوپ نہیں تھا جسے دیکھنے راولپنڈی میں 17 ہزار شائقینِ کرکٹ امڈ آئے تھے۔ بابر کا وہ 'ورژن' جو کبھی تماشائیوں کی بھیڑ سٹیڈیمز تک لایا کرتا تھا، اب نجانے کن کن حوادث کی دُھول میں کھو چکا ہے۔

چار سال پیچھے جو بابراعظم کریز کی سمت آتے ہوئے سہل قدم اور مرتکز نظر آیا کرتے تھے، اب اسی کریز کی جانب قدم بڑھاتے مضطرب نظر آتے ہیں۔

جو کندھے کبھی جوش سے امڈ کر کلائیوں کے بل پر رنز کی ضیافت سجایا کرتے تھے، اب محض توقعات کے وزن سے ہی بوجھل دکھائی دیتے ہیں۔

جب پاکستان نے بابراعظم کو ٹی ٹونٹی کرکٹ سے ڈراپ کیا، تب شائقین کا ایک بڑا حصہ بھی خود بخود اس منظر نامے سے 'ڈراپ' ہو گیا تھا۔ بطور ایتھلیٹ، یہ بابر اعظم کا طُرہ ٹھہرا کہ ڈھیروں ناظرین کے لیے پاکستان کرکٹ کا مقصود و مفہوم وہی تھے۔

کچھ ہفتے پہلے، جب ایک پریس کانفرنس میں مائیک ہیسن سے بابر کی بابت سوال اٹھایا گیا تو انھوں نے ٹیم میں واپسی کے لیے کھیل میں بہتری کو بنیادی تقاضا ٹھہرایا۔ ہیسن کے مطابق بگ بیش لیگ بابراعظم کے لیے کم بیک کا دروازہ ثابت ہو سکتی تھی۔

بگ بیش کی تو ابھی تشہیری مہم ہی شروع ہوئی ہے، مگر بابراعظم ٹیم میں واپس آ چکے ہیں۔ قابلِ غور یہ بھی ہے کہ مئی سے اب تک انھوں نے کسی مسابقتی کرکٹ میں حصہ نہیں لیا تھا، جو مائیک ہیسن کا تقاضا نبھانے کو کوئی ڈیٹا ہی فراہم کر سکتی۔

جس عہد میں کرکٹ مہارت کی بجائے ہندسوں کا کھیل بن چکی ہو، اس مارا ماری میں بابراعظم جیسے کرکٹرز کی زندگی آسان نہیں ہو سکتی۔

جو شہرت بابر کی عمومی زندگی سہل کرتی ہے، وہی ان کی تازہ مشکل بھی بڑھاتی ہے کہ حریف کوئی سا بھی ہو، ہر ٹیم کا ہر بولر انہی کی وکٹ کی 'ٹرافی' پانا چاہتا ہے۔

جب کسی ڈیٹا اینالسٹ نے ایک بار آف سٹمپ کے باہر وراٹ کوہلی کی کمزوری پکڑ لی تھی تو پھر دنیا تین برس تک ان کی سینچری دیکھنے کو ترس گئی تھی۔

شہرت پانے کے بعد جب کسی 'سٹار' کی ایک نمایاں کمزوری دنیا کو نظر آ جائے تو اس کے لیے 'کم بیک' بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

وجہ اس کی شاید یہ بھی ہے کہ جب ایک کھلاڑی اپنے کھیل کا ایک 'بلائنڈ سپاٹ' ہمراہ ہوتے ہوئے بھی دنیا پر اپنا سکہ جما چکا ہو تو اسے مزید کسی 'پرفیکشن' کی طلب رہ ہی نہیں سکتی۔

مگر جب ایک معمولی سی کجی متواتر اس سٹارڈم کا ٹھٹھہ اڑانے لگے تو پھر سے ڈرائنگ بورڈ کی طرف پلٹنا ضروری ہو جاتا ہے۔

بابراعظم کا مخمصہ یہ بھی ہے کہ ان کے لیے 'ڈرائنگ بورڈ' کی طرف پلٹنے کی ضرورت شاید کبھی محسوس ہی نہیں کی گئی۔

کین ولیمسن کی مثال لیتے ہیں۔ جب انھیں آف سٹمپ کے باہر ہارڈ لینتھ پر سلپ میں کیچ کا 'عارضہ' اپنی طرف آتا دکھائی دیا تو انھوں نے ہفتوں اپنے نیٹ پریکٹس سیشنز ایک نئے شاٹ کی تخلیق میں بسر کر ڈالے جہاں ہارڈ لینتھ پر 'پلے بیک' کے بجائے انھوں نے اسے لیٹ کھیل کر تھرڈ مین باؤنڈری کو نشانہ بنانا سیکھا۔

کین ولیمسن جس کرکٹ کلچر کے نمائندہ ہیں، وہاں کے عوامل اگرچہ بہت مختلف ہیں مگر جس کرکٹنگ بیوروکریسی کے تحت بابر اپنا کیریئر گزار رہے ہیں، لگ بھگ وہی عوامل وراٹ کوہلی کو بھی درپیش رہے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں ذمہ داری کا زیادہ بوجھ سسٹم پر نہیں، فرد پر ہوتا ہے۔

کوربن بوش عمدہ فاسٹ بولر ہیں جو برق رفتاری سے ہارڈ لینتھ پھینکنا جانتے ہیں مگر بابراعظم کے لیے نامانوس ہرگز نہیں تھے۔ جو لینتھ انھوں نے 'ٹرافی وکٹ' حاصل کرنے کے لیے چنی، وہ بھی بابراعظم کے لیے نئی نہیں تھی۔

اگر بابراعظم کا چار سال پرانا ورژن یہاں سامنے ہوتا تو شاید وہ گیند سامنے کھیلی ہی نہ جاتی بلکہ ایک قدم پیچھے لے کر، تھوڑا لیٹ کھیلتے ہوئے، پیس کے بل پر ہی، تھرڈ مین باؤنڈری کو داغی جاتی۔ مگر یہاں بابر جلد کھیلے، مضطرب کھیلے اور مضمحل ٹھہرے۔

ٹیلنٹ کی کہیے تو بابراعظم اک گوہرِ نایاب ہیں۔ پاکستان کرکٹ نے کئی دہائیوں میں ایسا بلے باز نہیں دیکھا۔ مگر جو ہنر سیکھ کر وہ اس پائیدان تک پہنچے ہیں، اب ان میں سے کچھ بھلانا بھی ضروری ہیں۔

جب کوئٹہ میں رنگ برنگے بادلوں کے سبب 'میزائل تجربے' کی افواہیں پھیلیں

آسمان پر ایسا دلکش نظارہ جیسے سر پر پھیلی کسی نیلی چادر پر مختلف رنگوں سے کوئی آرٹ کا شاہکار بنا رہا ہو۔ کوئٹہ اور اس سے ملحقہ علاقوں میں آسمان پر نظر آنے والا یہ منفرد نظارہ نہ صرف لوگوں کو محظوظ کر رہا تھا بلکہ ان کے دماغوں میں ایک سوال کو بھی جنم دے رہا تھا کہ آخر یہ ہے کیا؟

سوشل میڈیا پر متعدد صارفین آسمان پر پھیلنے والے ان رنگوں کو کسی 'بیلسٹک میزائل کا تجربہ' قرار دیتے ہوئے نظر آئے۔

یہ خوبصورت منظر کوئٹہ کے علاوہ مچھ، چاغی، نوشکی، قلعہ عبداللہ، پشین اور دیگر علاقوں میں بھی نظر آیا تھا۔

ابھی کسی 'میزائل تجربے' کی افواہیں پھیلنا شروع ہی ہوئیں تھیں کہ پاکستان کے محکمہ موسمیات اور ماہرین نے 'تجربوں' کی تمام افواہوں پر پانی پھیر دیا اور کہا کہ آسمان پر پھیلنے والے یہ رنگ کوئی غیر معمولی چیز نہیں بلکہ بادلوں کی ہی شکل ہیں۔

محکمہ موسمیات کا کیا کہنا ہے؟

پاکستان کے محکمہ موسمیات نے اپنے ایک بیان میں آسمان پر نظر آنے والی اس کیفیت کو 'لینٹیکولر کلاوڈ فارمیشن' کا نام دیا۔

محکمہ موسمیات کے مطابق آسمان پر یہ بادل 28 اکتوبر کو علی الصبح کوہِ مردار کے اوپر نظر آئے تھے۔

'یہ بادل طلوعِ سحر سے پہلے نمودار ہوئے، تقریباً 20 منٹ تک موجود رہے اور سورج کے طلوع ہونے سے پہلے غائب ہو گئے۔'

'یہ تاثر غلط ہے کہ یہ کوئی خاص بادل ہے اور بہت زیادہ بارش ہوگی'

ماہرین کا کہنا ہے کہ آسمان پر رنگ برنگے بادلوں کا نمودار ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

محکمہ موسمیات کے سابق ڈائریکٹر جنرل محمد حنیف نے بی بی سی اردو کو بتایا کہ ایسے بادل فضا میں کبھی کبھار بنتے رہتے ہیں۔

محمد حنیف کے مطابق یہ بادلوں کی ہی ایک شکل ہے۔

'جب کبھی مستحکم ماحول میں ہوا میں موجود نمی یا آبی بخارات پہاڑوں کے ساتھ یا اس کے اوپر سے گزر رہے ہوتے ہیں تو ان کا اوپر والا حصہ نیچے کی طرف اور نیچے والا حصہ اوپر کی طرف چلا جاتا ہے۔'

ان کا مزید کہنا تھا کہ ان آبی بخارات کے حصے میں موجود نمی عموی طور پر گرم ہوتی ہے 'لیکن اگر درجہ حرارت کم ہو جائے تو یہ نمی آبی ذرات میں تبدیل ہو کر بادل کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور ایسے مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں۔'

'یہ بادل بنتے رہتے ہیں اور کوئٹہ یا دیگر علاقوں میں اس کی شکل کچھ مختلف تھی اور اسی لیے لوگوں نے مختلف نوعیت کی باتیں کیں ورنہ یہ کوئی خاص یا نئی چیز نہیں۔'

محمد حنیف کے مطابق یہ صرف بادل ہیں اور انھیں صرف بادل ہی سمجھا جانا چاہیے۔

'یہ تاثر غلط ہے کہ یہ کوئی خاص بادل ہیں اور اس کے سبب بہت زیادہ بارش ہوگی یا کوئی اور بڑی تبدیلی آئے گی۔'

محکمہ موسمیات کے ایک اور سابق افسر اس منظر میں سورج اور چاند کی روشنی کے عمل دخل کا بھی ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سابق چیف میٹرولوجسٹ غلام رسول کا بھی کہنا ہے کہ پہاڑی علاقوں میں ہوا میں موجود نمی جب اوپر کی طرف اڑ جاتی ہے تو آسمان پر اس طرح کے رنگ برنگے دائرے بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

'ان آبی بخارات پر جب سورج یا چاند کی روشنی پڑتی ہے تو پہاڑی علاقوں میں کچھ دیر کے لیے آسمان پر ایک خوبصورت سا منظر بن جاتا ہے۔'

'اس کی زیادہ سے زیادہ عمر دس یا بیس منٹ تک ہوتی ہے اور اس کے بعد یہ غائب ہو جاتے ہیں۔'

ان کا کہنا تھا کہ ایسے بادل دن میں بھی بنتے ہیں لیکن اس وقت سورج کی روشنی زیادہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتے ہیں۔

'یہ عام سی چیز ہے لیکن چونکہ ان میں رنگ بھرے نظر آتے ہیں اس لیے یہ لوگوں کی توجہ کے مرکز بنتے ہیں۔'

پٹنی اسپتال کا فری میڈیکل کیمپ

عوام کو معیاری علاج کی سہولت فراہم

نیوکراچی میں اسپتال کے سیکنڈ فلور کا افتتاح، چار سو افراد کو مفت چیک اپ اور ادویات فراہم کی گئیں، مہمان خصوصی مفتاح اسماعیل نے خدمات کو سراہا

رپورٹ۔۔زاہد علی شاہ

نیوکراچی میں پٹنی چیریٹیبل اسپتال نے ایک روزہ فری میڈیکل کیمپ کا انعقاد کر کے عوامی خدمت کا ایک اور روشن باب رقم کیا۔ اس کیمپ میں شہر کے مختلف شعبوں کے رہنما، سماجی وسیاسی شخصیات نے شرکت کی اور اسپتال کی خدمات کو سراہا۔ مہمان خصوصی سابق وزیرخزانہ اور عوام پاکستان پارٹی کے سیکرٹری جنرل مفتاح اسماعیل نے اسپتال کے سیکنڈ فلور کا افتتاح بھی کیا، جو اسپتال کی ترقی اور عوامی خدمت میں اضافے کا ثبوت ہے۔

مفتاح اسماعیل نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پٹنی اسپتال غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے ایک نعمت ہے، جو کم قیمت میں معیاری طبی سہولیات فراہم کر رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ مہنگائی کے دور میں عوام کو علاج معالجے کی سہولیات دینا نہ صرف خوش آئند ہے بلکہ پربھاس پٹن سمیت پٹنی مسلم جماعت کی پوری کابینا اور کونسل بورڈ ارکان اس کام کے لیے خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ اسپتال کے وارڈز جدید اور صاف ستھرے ہیں، اور اہلیانِ علاقہ کے لیے یہ اسپتال کسی تحفے سے کم نہیں۔

ڈپٹی کنوینز محمد حسین پٹنی نے بتایا کہ فری میڈیکل کیمپ میں چار سو سے زائد افراد کو مستند ڈاکٹروں کے ذریعے چیک اپ کرایا گیا۔ کیمپ میں مفت ادویات، خون کے ٹیسٹ، ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کی سہولت بھی فراہم کی گئی۔ خواتین کے لیے خصوصی گائنی سروسز کا بھی انتظام تھا، جس میں لیڈی ڈاکٹروں نے معائنہ کیا اور ادویات فراہم کیں۔ انہوں نے کہا کہ پٹنی اسپتال میں قابل ڈاکٹرز اور پی ڈیز کے ذریعے عوام کو مستقل طبی سہولیات بھی فراہم کر رہے ہیں۔

یہ فری میڈیکل کیمپ نہ صرف صحت کے مسائل حل کرنے کی کوشش تھی بلکہ عوام اور اسپتال کے درمیان اعتماد اور تعلق کو بھی مضبوط بنانے کا ایک مؤثر اقدام تھا۔ پٹنی اسپتال نے ثابت کیا کہ عوامی خدمت کے لیے عزم، محنت اور نظم ونسق کس طرح قابل تعریف نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے اقدامات شہر کے معاشرتی اور صحت کے شعبے میں مثبت تبدیلی کے روشن نمونہ ہیں، جو دیگر اداروں کے لیے بھی مثال قائم کرتے ہیں۔

دعا بھی
علاج بھی
پٹنی
چیئریٹیبل اسپتال
PATNI
CHARITABLE HOSPITAL
پٹنی
چیرٹیبل ہسپتال
Under Management Parbhas Patan Samast Patni Muslim Jamat
مستحق مریضوں کے لیے خصوصی رعایت
جدید ترین آلات اور ماہر ڈاکٹرز
خواتین اور بچوں کے لیے علیحدہ وارڈز
ایمرجنسی سہولت 24 گھنٹے میسر
صاف ستھرا ماحول اور بہترین نگہداشت
ADDRESS
126/14 Sector 5-F
New Karachi
PHONE
0325-3152000
صدر ولی محمد ملیک
جنرل سیکریٹری ہارون ناخوا
پٹنی اسپتال نیو کراچی کے دورے پر صدر پٹنی برادری ولی محمد ملیک، یوسف سومرہ، حسین پٹنی و دیگر کا گروپ فوٹو
مریم علی۔ محمد گوال

A & R
Builders
& Developers
کنسٹرکشن کی دنیا کا مستند نام
احمد اینڈ رحمان
بلڈرز اینڈ ڈیولپرز
جدت، معیار اور اعتماد کی پہچان
آج بنائیں آنے والی نسلوں کے لیے
ریذیڈینشل، کمرشل، پلازہ، انڈسٹریل
ہر نوعیت کے پروجیکٹس میں ماہر
خواب آپ کے... تعبیر ہماری
On-Time Delivery
High-Quality Material
بنیاد مضبوط — مستقبل روشن
پروفیشنل انجینئرز اور اسکلڈ ٹیم
پائیدار اور بہترین تعمیر
BOOK NOW
0319-1150002
READ MORE ONLINE
ahmedrehmanbuilders.com
آج ہی رابطہ کریں!